متاعِ آخرِ شب
حفیظ میرٹھی
الکتاب
حیدرآباد

اظہارِ تشکّر

میں شکرگزار ہوں مُحبّی عزیز بجھروی اور مُحبّی مسعود اختر کا جنھوں نے اس کتاب کی ترتیب و تزئین اور دیگر مراحل کی تکمیل میں معاونت کی اور جناب حافظ رفیق احمد صاحب پروپرائٹر "**الکتاب**" حیدرآباد کا خاص طور پر اس لیے ممنون ہوں کہ موصوف نے "متاعِ آخرِ شب" کی اشاعت کو ہر لحاظ سے معیاری بنانے کی راہ میں تجارتی نقطۂ نظر کو حائل نہیں ہونے دیا۔

حفیظ میرٹھی

متاعِ آخرِ شب

حفیظ میرٹھی

مجموعہ : متاعِ آخرِ شب

شاعر : حفیظ الرحمٰن حفیظ میرٹھی

ترتیب وانتخاب : مسعود اختر

ناشر : ابو عمار رفیق احمد

خوشنویس : سیّد ابو جعفر زیدی

سرورق : سیّد ریاض الامین

تعداد : دو ھزار

مطبع : بھارت آفسٹ - دھلی ٦

سنہ اشاعت : دسمبر ١٩٨٦ء

قیمت : چالیس روپے

ملنے کے پتے

① الکتاب - اے - ۱۱۱ - میور کشالس - عابد روڈ - حیدر آباد - ۵۰۰۰۰۱

② مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی - ۱۱۰۰۰۶

③ کریسینٹ پبلشنگ کمپنی، دہلی - ۱۱۰۰۰۶

④ مکتبۂ حفیظیہ - ۱۴۰ - پڑوا شیخ لال - میرٹھ

اِنتساب

اپنی بیٹی

حسین غزالہ فلاحی

کے

نام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ ناشر

زندگی مقصد کے ساتھ جینے کا نام ہے۔ مقصد جتنا بلند ہوگا، زندگی بھی اتنی ہی اعلیٰ و ارفع ہوگی۔ مقصد کے ساتھ گہرا ربط و تعلق قائم رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ فکر و نظر کی صحیح بنیادیں ہمارے سامنے ہوں اور ہمارا زاویۂ نگاہ درست ہو۔ کیونکہ اس کے بغیر مقصد کے تعین کے باوجود مقصدِ حیات سے والہانہ تعلق قائم رکھنے میں ہم ناکام رہیں گے۔

آج کے اس فکری بے راہ روی کے دور میں صحیح فکر کی اہمیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ آزادیٔ فکر اور آزاد خیالی کے نام پر فکر کی اصل اساس پر آج ضرب کاری لگائی جا رہی ہے اور مقصدِ حیات کے صحیح فکر و اساس پر یقین رکھنے والوں کو "بنیاد پرست" کہہ کر مطعون کیا جا رہا ہے۔ پھر اس کے ساتھ شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کی ایک بھیڑ ہے۔ جن کی نگارشات پر نظر ڈالیں تو آپ دیکھیں گے کہ نہ وہ صحیح اقدارِ حیات سے آشنا ہیں اور نہ انھیں کسی صحیح فکر و اساس کی خبر ہے۔

اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے اردو کلاسیکی غزل کے پاسدار، محافظ اقدار نامور معاصر شاعر حفیظ میرٹھی کے کلام کی اشاعت میرے نزدیک ادب و اقدارِ حیات کی ایک اہم خدمت ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ حضرت حفیظ میرٹھی کے پاکیزہ کلام 'متاعِ آخرِ شب' کو منظرِ عام پر لانے کی سعادت ادارہ الکتاب کو حاصل ہو رہی ہے اور اس طرح میری اپنی ایک دیرینہ خواہش کی تکمیل بھی ہو سکی جس کا ذکر میں نے آج سے بہت پہلے بعض ناشرین سے کیا تھا۔

مجھے امید ہے کہ اہلِ ذوق اسے قدر کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔

ابو عمار

تو جوہری ہے تو زیبا نہیں تجھے یہ گریز
مجھے پرکھ مری شہرت کا انتظار نہ کر

نعت

شاہوں کے بھی سرتاج غلامانِ محمدؐ
یارانِ محمدؐ تو ہیں یارانِ محمدؐ

تابندہ عقیدہ دیا تہذیب عطا کی
تاریخ نہ بھولے گی یہ احسانِ محمدؐ

محدود نہیں ہے یہ مہ و سال و صدی میں
ہر دَور کی آواز ہے اعلانِ محمدؐ

بے مثل صحیفے کی طرح سینۂ اطہر
جزدان کی مانند گریبانِ محمدؐ

گھبرا کے مسلمان یہ کیا ڈھونڈھ رہا ہے؟
کیا چھوٹ گیا ہاتھ سے دامانِ محمدؐ؟

بڑے ادب سے غرورِ ستمگراں بولا
جب انقلاب کے لہجے میں بے زباں بولا

"تکوگے یونہی ہواؤں کا منہ بھلا کب تک؟"
یہ ناخداؤں سے اک روز بادباں بولا

ابھی سے ہوش اُڑے مصلحت پرستوں کے
ابھی میں بزم میں آیا ابھی کہاں بولا

چمن میں سب کی زباں پر تھی میری مظلومی
مرے خلاف جو بولا تو باغباں بولا

"یہی بہت ہے کہ زندہ تو ہو میاں صاحب!"
زمانہ سُن کے مرے غم کی داستاں بولا

تُلے ہیں قتل پہ پھولوں میں تولنے والے
اک ایسا بول میں جھوٹوں کے درمیاں بولا

حصارِ جبر میں زندہ بدن جلائے گئے
کسی نے دم نہیں مارا مگر دھواں بولا

اثر ہوا تو یہ تقریر کا کمال نہیں
مرا خلوص مخاطب تھا میں کہاں بولا

"کہا نہ تھا کہ نوازیں گے ہم حفیظؔ تجھے"
اُڑا کے وہ مرے دامن کی دھجیّاں بولا
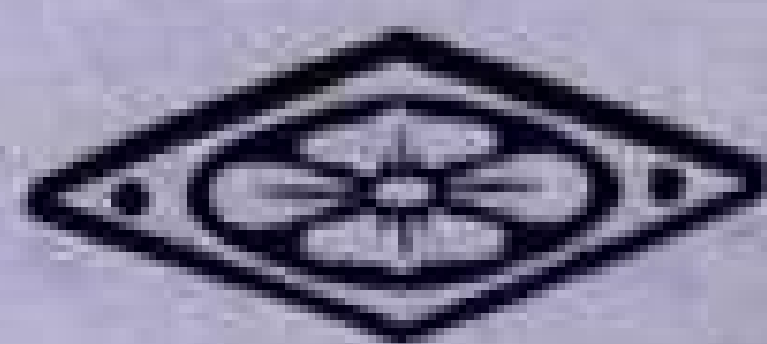
ایسی آسانی سے قابو میں کہاں آتی ہے آگ
جب بھڑکتی ہے تو بھڑکے ہی چلی جاتی ہے آگ

خاک سرگرمی دکھائیں بے حِسی کے شہر میں
برف کے ماحول میں رہ کر ٹھٹھر جاتی ہے آگ

پاسباں آنکھیں مَلے، انگڑائی لے، آواز دے
اتنے عرصے میں تو اپنا کام کر جاتی ہے آگ

آنسوؤں سے کیا بجھے گی دوستو دل کی لگی
اور بھی پانی کے چھینٹوں سے بھڑک جاتی ہے آگ

حل ہوئے ہیں مسئلے شبنم مزاجی سے مگر
گتھیاں ایسی بھی ہیں کچھ جن کو سلجھاتی ہے آگ

یہ بھی اک حسّاس دل رکھتی ہے پہلو میں ضرور
گُدگُداتا ہے کوئی جھونکا تو بل کھاتی ہے آگ

جب کوئی آغوش کُھلتا ہی نہیں اس کے لیے
ڈھانپ کر منہ راکھ کے بستر پہ سوجاتی ہے آگ

امن ہی کے دیوتاؤں کے اشاروں پر حفیظ
جنگ کی دیوی کُھلے شہروں پہ برساتی ہے آگ

مہرباں وہ لبِ جو آج ہوا پانی پر
چھیڑ کر پاؤں سے احسان کیا پانی پر

نقش کا تو کبھی جادو نہ چلا پانی پر
رنگ کائی کا مگر جم کے رہا پانی پر

موجۂ مے سے تراشا ہوا اندازِ خرام
آپ چلتے ہیں کہ چلتی ہے صبا پانی پر

ہو گیا شیخ کی مہمان نوازی کا شکار
اکتفا رند کو کرنا ہی پڑا پانی پر

لیجیے مل گئی بیچارے غریبوں کو دوا
پڑھ کے اک شخص نے کچھ پھونک دیا پانی پر

خون اس دَورِ گرانی میں بہت سستا ہے
رات پھر گاؤں میں اک قتل ہوا پانی پر

کتنے پانی میں ہوں میں جان گیا یہ پانی
اک جھجک نے ہی بھرم کھول دیا پانی پر

جھیل میں ڈوب گیا جان سے بیزار بدن
تیرتا رہ گیا مٹّی کا گھڑا پانی پر

یہ بتا کر کہ گلاسوں کی شرارت تھی حفیظؔ
دھو دیا ہم نے وہ الزام جو تھا پانی پر

بزمِ تکلّفات سجانے میں رہ گیا
میں زندگی کے ناز اُٹھانے میں رہ گیا

تاثیر کے لیے جہاں تحریف کی گئی
اک جھول بس وہیں پہ فسانے میں رہ گیا

سب مجھ پہ مُہرِ جرم لگاتے چلے گئے
میں سب کو اپنے زخم دکھانے میں رہ گیا

خود حادثہ بھی موت پہ اس کی تھا دم بخود
وہ دوسروں کی جان بچانے میں رہ گیا

اب اہلِ کارواں پہ لگاتا ہے تُہمتیں
وہ ہمسفر جو چلتے بہانے میں رہ گیا

میدانِ کارزار میں آئے وہ قوم کیا
جس کا جوان آئنہ خانے میں رہ گیا

وہ وقت کا جہاز تھا کرتا لحاظ کیا
میں دوستوں سے ہاتھ ملانے میں رہ گیا

بازارِ زندگی سے قضا لے گئی مجھے
یہ دَور میرے دام لگانے میں رہ گیا

یہ بھی ہے ایک کارِ نمایاں حفیظ کا
کیا سادہ لوح کیسے زمانے میں رہ گیا

پونچھے گا نہ کوئی بھی دلِ زار کے آنسو
خود خاک میں مل جائیں گے تھک ہار کے آنسو

منہ پھیر لیں ہمدرد تو احسان کریں گے
غم اور بڑھا دیتے ہیں غمخوار کے آنسو

آنکھوں کی قسم ہم سے تو دیکھے نہیں جاتے
نادار کے آنسو ہوں کہ زردار کے آنسو

تنہائی میں ساقی کے قدم چوم رہے ہیں
میخانے سے روٹھے ہوئے میخوار کے آنسو

ہنس کر وہ مرے گریۂ پیہم پہ یہ بولے
کیا دیکھیے دیکھے ہوئے سو بار کے آنسو

ہر سنگ ہے غم کے لیے اک شیشۂ نازک
اک ٹھیس میں آجاتے ہیں پندار کے آنسو

تخلیق میں آتے نہیں شہکار کے انداز
جب تک نہ سنواریں اسے فنکار کے آنسو

ہم نے بھی جگر تھام کے دیکھے ہیں حفیظ آج
رخسارِ غزل پر ترے اشعار کے آنسو

قہر آلود تھے ماحول کے تیور کتنے
معرکے پھر بھی محبّت نے کیے سر کتنے

وہ جو دھندلائے ہوئے نقش تھے اُمیدوں کے
ہو گئے ایک تبسّم سے اُجاگر کتنے

دلِ انساں پہ حوادث کی یہ چوٹیں توبہ
پھول کے سینے پہ توڑے گئے پتّھر کتنے

اپنی ہستی پہ نہ اِترائے کوئی کوہِ غرور
وقت نے پھینک دیئے ایسے اٹھا کر کتنے

مُڑ کے دیکھا تو نظر آئے بہت چیں بجبیں
یہی احباب ملے تھے ابھی ہنس کر کتنے

مجھ کو طوفان سے لڑنے میں مزا آتا ہے
ورنہ بہہ جاتے ہیں سیلاب کے رُخ پر کتنے

مدّتوں پھول سمجھتی رہی اِن کو دنیا
ہم نے تو زخم بھی رکھّے ہیں سجا کر کتنے

آپ کا دم بھی غنیمت نظر آتا ہے حفیظؔ
رہ گئے ہیں بھلا اب ایسے قلندر کتنے

لہو سے اپنے زمیں لالہ زار دیکھتے تھے
بہار دیکھنے والے بہار دیکھتے تھے

سرور ایک جھلک کا تمام عمر رہا
ہوَس پرست تھے جو بار بار دیکھتے تھے

کبھی کبھی ہمیں دُنیا حسین لگتی تھی
کبھی کبھی تری آنکھوں میں پیار دیکھتے تھے

چلا وہ دَورِ ستم گھر میں چھپ کے بیٹھ گئے
جو ہر صلیب کو مردانہ وار دیکھتے تھے

ملے تھے ملنے کو لیکن جُدا جُدا ہی رہے
سبب یہ ہے کہ سب اپنا وقار دیکھتے تھے

نہ دیجیے انھیں الزام قتل کا وہ تو
بس اک ذرا نئے خنجر کی دھار دیکھتے تھے

صبا نے لمس کا مرہم جو زخمِ گُل پہ رکھا
تری طرف ترے سینہ فگار دیکھتے تھے

اگرچہ بسترِ آسودگی پہ تھے پھر بھی
وطن کے خواب غریب الدّیار دیکھتے تھے

کسی کو درسِ قناعت حفیظؔ کیا دیتے
خود اپنے گرد ہوس کا حصار دیکھتے تھے

نہیں ہوتیں کبھی ساحل کے ارمانوں سے وابستہ
ہماری کشتیاں رہتی ہیں طوفانوں سے وابستہ

ہمارا ہی جگر ہے یہ ہمارا ہی کلیجہ ہے
ہم اپنے زخم رکھتے ہیں نمکدانوں سے وابستہ

نہ لے چل خانقاہوں کی طرف شیخِ حرم مجھ کو
مجاہد کا تو مستقبل ہے میدانوں سے وابستہ

میں یوں رہزن کے بدلے پاسباں پر وار کرتا ہوں
مرے گھر کی تباہی ہے نگہبانوں سے وابستہ

ہماری بے قراری کو نہ چھیڑو مطمئن لوگو!
کہ تقدیرِ سکوں ہے ہم پریشانوں سے وابستہ

کہیں مسلی ہوئی کلیاں، کہیں روندے ہوئے غنچے
بہت سی داستانیں ہیں شبستانوں سے وابستہ

مورّخ! تیری رنگ آمیزیاں تو خوب ہیں لیکن
کہیں تاریخ ہو جائے نہ افسانوں سے وابستہ

ابھی یہ چلتے چلتے دیکھ لیتے ہیں خراشوں کو
ابھی کچھ اور زنجیریں ہیں دیوانوں سے وابستہ

محبت خامشی بھی، چیخ بھی، نغمہ بھی، نعرہ بھی
یہ اک مضمون ہے کتنے ہی عنوانوں سے وابستہ

حفیظِ میرٹھی کو کون پہچانے کہ بے چارہ
نہ ایوانوں سے وابستہ، نہ دربانوں سے وابستہ

سوز نہ ہو تو سازِ حیات
بس اک روکھی پھیکی بات

جل اُٹھ جل اُٹھ شمعِ یقیں
رات ہے اور اندھیری رات

آہ یہ حُسن کی نایابی
اُف یہ جلووں کی بُہتات

ان کا کھیل دل آزاری
اور مرے نازک جذبات

جان ہتھیلی پر رکھ لے
کہنی ہے گر سچّی بات

پھول تو رہ گئے کیسے زرد ہلے
اور شبنم نے موتی لُٹا بھی دیے

اُن کے جانے کا منظر تماشہ نہیں
دور تک دیکھیے، دیر تک سوچیے

ہم تو دیوانے ٹھہرے ہمیں کیا خبر
جانے کیوں ہنس پڑے جانے کیوں رو دیے

درد پر تبصرہ تو بہت ہو چکا
درد کو آپ محسوس بھی کیجیے

جام ساقی نے جب بے رُخی سے دیا
میکدے سے نکل آئے ہم بے پیے

شیخ صاحب تمھاری بھی اچّھی کٹی
خوب سجدے کیے، خوب دھوکے دیے

انجمن کیف و مستی میں ڈوبی رہی
شمع گھلتی رہی انجمن کے لیے

اے حفیظؔ اس نے کس سادگی سے کہا
آپ کیا عرض کرتے ہیں فرمائیے

سمٹے بیٹھے ہو کیوں بُزدلوں کی طرح
آؤ میدان میں غازیوں کی طرح

کون رکھتا ہمیں موتیوں کی طرح
مل گئے خاک میں آنسوؤں کی طرح

روشنی کب تھی اتنی مرے شہر میں
جل رہے ہیں مکاں مشعلوں کی طرح

داد دیجے کہ ہم جی رہے ہیں وہاں
ہیں محافظ جہاں قاتلوں کی طرح

زندگی اب ہماری خطا بخش دے
دوست ملنے لگے مُحسنوں کی طرح

کیسے اللہ والے ہیں یہ اے خدا
گفتگو، مشورے، سازشوں کی طرح

میری باتوں پہ ہنستی ہے دُنیا ابھی
میں سُنا جاؤں گا فیصلوں کی طرح

تم بھی دربار میں حاضری دو حفیظؔ
پھر رہے ہو کہاں مفلسوں کی طرح
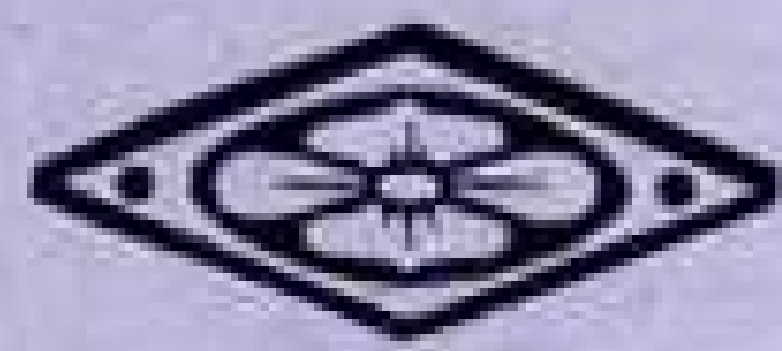
چاہے تن من سب جل جائے
سوزِ دروں پر آنچ نہ آئے

شیشہ ٹوٹے، غُل مچ جائے
دل ٹوٹے آواز نہ آئے

بحرِ محبّت توبہ! توبہ!
تیرا جائے نہ ڈوبا جائے

اے وائے مجبوریِ انساں
کیا سوچے اور کیا ہو جائے

ہائے وہ نغمہ جس کا مغنّی
گاتا جائے، روتا جائے

عزّت ، دولت آنی جانی
مل مل جائے چھن چھن جائے

جس کو ہو کہنی دل کی کہانی
سرتا پا دھڑکن بن جائے

دُنیا کا اپنانا ہی کیا
کانٹے اپنے پھول پرائے

میخانے کی سمت نہ دیکھو
جانے کون نظر آ جائے

کاش ہمارا فرضِ محبّت
عیشِ محبّت پر چھا جائے

کارواں چاہے مختصر ہو جائے
کوئی رہزن نہ ہمسفر ہو جائے

خام اب بھی نہیں ہے عشق مگر
چوٹ کھالے تو پختہ تر ہو جائے

بارِ مرہم بھی زخم پر منظور
تاکہ تسکینِ چارہ گر ہو جائے

اس فریبِ سکون و راحت پر
اتنا ہنسیے کہ آنکھ تر ہو جائے

ہو نہ تقدیر کا اگر قائل
آدمی، آدمی کے سر ہو جائے

دھڑکنیں ہیں اب اہلِ دل کا پیام
سُننے والا قریب تر ہو جائے

جائیے ہو کے بے قرار کہاں
سب ہیں غمگین، غمگسار کہاں

اب کے پھولوں میں وہ مہک ہی نہیں
لُٹ گئی عصمتِ بہار کہاں

دیر کے پاس یا حرم کے قریب
ہم کریں تیرا انتظار کہاں

ہر گھڑی لب پہ ذکرِ یار تو ہے
دل میں ہر دم خیالِ یار کہاں

ایک انداز پر رہے قائم
زندگی اتنی وضعدار کہاں

درد ہی چین سے نہیں رہتا
دل میں گنجائشِ قرار کہاں

آدمی بے چین ہے، بدحال ہے، رنجیدہ ہے
اے مرے احساس تو آخر کہاں خوابیدہ ہے

شکر ہے اس پر کسی کی بھی نظر جاتی نہیں
مسکراہٹ میں ہماری کرب جو پوشیدہ ہے

دو گھڑی مل بیٹھنے سے سب پتہ چل جائے گا
جو بظاہر خوش ہے وہ بھی اصل میں رنجیدہ ہے

اُس طرف مت دیکھیے، مت دیکھیے، مت دیکھیے
وہ نظر بھی کام کر جائے گی جو دزدیدہ ہے

جتنا سُلجھاؤ گے یہ اتنا الجھتا جائے گا
مسئلہ تقدیر کا یارو بہت پیچیدہ ہے

یوں تو ہر آنسو ہے میری آنکھ کا تارا حفیظؔ
جو غمِ جاناں نے بخشا آبروئے دیدہ ہے

خلوصِ دل کی جھلک جب سخن میں آئی ہے
تو زندگی سی نظر انجمن میں آئی ہے

ہمیں تو بادِ صبا کا بھی اعتبار نہیں
خزاں سے ہاتھ ملا کر چمن میں آئی ہے

تمہاری یاد نے روشن کیے ہیں دل میں چراغ
تمہارے ذکر سے خوشبو دہن میں آئی ہے

کرم ہے یہ بھی مسافر نواز لوگوں کا
ہماری لاش ہمارے وطن میں آئی ہے

یہ کیا سلوک محبت سے آدمی نے کیا
لباسِ گُل میں گئی تھی کفن میں آئی ہے

حفیظؔ تم ہی ذرا زندگی سے بات کرو
جو دل کا درد لیے اہلِ فن میں آئی ہے

ہم مخلصوں کے ان سے جو دشمن بہت ملے
یارانِ باوفا سے وہ بدظن بہت ملے

یہ اور بات ہے کہ اندھیرا دلوں میں تھا
اُس بزم میں چراغ تو روشن بہت ملے

نزدیک آتے آتے برہمن ٹھٹک گیا
جب شیخ کے قریب ہریجن بہت ملے

بے فکر و مطمئن تھے جو رکھتے نہ تھے دماغ
عقدہ کشا لیے ہوئے اُلجھن بہت ملے

پہنچے گا کارواں یہ کہاں ہم سمجھ گئے
رہبر کے ارد گرد جو رہزن بہت ملے

گہرا ہوا ہے رنگ اندھیرے کا جب حفیظؔ
امکان روشنی کے بھی روشن بہت ملے

جب سخن فہموں کی دُنیا میں کمی ہونے لگی
شاعری رُخصت ہوئی خانہ پُری ہونے لگی

میں نے چاہا تھا کہ دشمن کی تباہی پر ہنسوں
طعنہ زن مجھ پر مری شائستگی ہونے لگی

جب کسی گلفام کا دامن اُلجھ کر رہ گیا
خار کو محسوس اپنی برتری ہونے لگی

رفتہ رفتہ اور بھی پابندیاں ہٹ جائیں گی
مُحتسِب کے شہر میں شیشہ گری ہونے لگی

کس قدر تاریک تھیں راہیں مگر جب چل پڑے
خاک کے ذرّوں سے پیدا روشنی ہونے لگی

ہم تو اُٹھ آئے حفیظ احباب کو کر کے سلام
انجمن میں بحث جب بیکار کی ہونے لگی

ان رہبرانِ قوم کی کیا پیروی کریں
جو رہبری کے نام پہ سوداگری کریں

نادان تو نہیں ہیں کہ یوں خودکشی کریں
ہم اور تیرے درد سے پہلو تہی کریں!

ہر سمت ظلمتوں کے پرستار ہیں یہاں
شمعیں کدھر جلائیں کہاں روشنی کریں؟

دولت نے ہم سے ہاتھ ملایا تو ہے مگر
اس دشمنِ قرار سے کیا دوستی کریں

اے جبر آج فیصلہ کر کے اُٹھیں گے ہم
جُھک جائیں تیرے سامنے یا سرکشی کریں

مردانِ حق پرست کو ہر کربلا قبول
پیچیدہ مسئلہ ہو تو کچھ غور بھی کریں

پیغام یہ ملا ہے جنابِ حفیظؔ کو
انجام پہلے سوچ لیں تب شاعری کریں
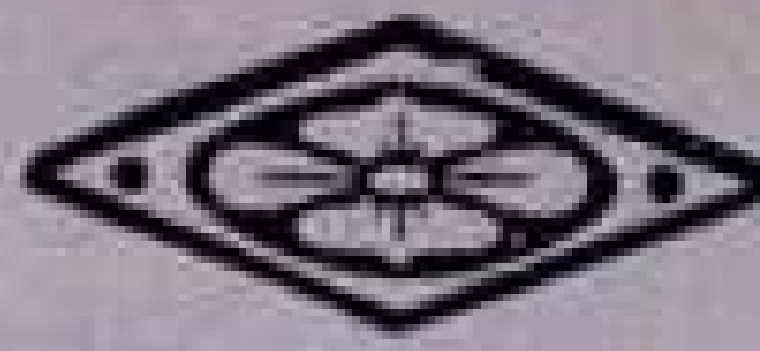
اک عندلیبِ زار ہی نالہ کُناں ملے
گلشن میں زندگی کا کوئی تو نشاں ملے

ہاتھ آ گئے جو چاند ستارے تو کیا ہوا
اُس آستاں کی خاک کے ذرّے کہاں ملے

اے کاش میرے اُجڑے نشیمن کے سامنے
خاموش سر جھکائے ہوئے باغباں ملے

اللہ رے بہار کی یہ چیرہ دستیاں
دامن یہاں ملے تو گریباں وہاں ملے

چھوٹوں سے یوں بڑوں کو تکبّر نہ چاہیے
جُھک کر ملے زمیں سے اگر آسماں ملے

اے دل ہجومِ غم میں غنیمت ہے بے کسی
چیخیں نکل پڑیں جو کوئی مہرباں ملے

آتی تھی قہقہوں کی صدا دور سے حفیظ
دیکھا قریب جا کے تو آنسو رواں ملے

جنونِ شوق سے جب کام جھنجلا کر لیا میں نے
حوادث کو ہم آہنگِ تمنّا کر لیا میں نے

اِدھر آ، آج تجھ سے رازِ سوز و ساز بھی کہدوں
رگوں میں خون، دل میں درد پیدا کر لیا میں نے

الٰہی کون سی منزل ہے یہ دُنیا پرستی کی؟
کسی نے نام پوچھا اور سجدہ کر لیا میں نے

نہ ہوں حیران میرے قہقہوں پر مہرباں میرے
فقط فریاد کا معیار اونچا کر لیا میں نے

خزاں کے خوف سے پھولوں نے شکلیں تک بدل ڈالیں
ادھر رنگِ قبا کچھ اور گہرا کر لیا میں نے

کبھی ایسی بھی رت لائے گی فطرت باغِ عالم میں
کہ جب جس شاخ پر چاہا بسیرا کر لیا میں نے

رسا ہوں یا نہ ہوں نالے یہ نالوں کا مقدّر ہے
حفیظؔ آنسو بہا کر جی تو ہلکا کر لیا میں نے
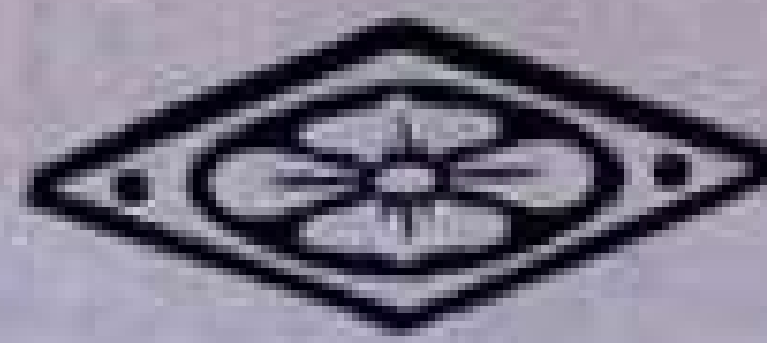
اثر کیا خاک ہو گا اس کی باتوں کا زمانے پر
جو خود اک مستقل تنقید ہو اپنے فسانے پر

کہاں کے ناخدا، کس کے سفینے، دست و بازو کیا
خدا ہی یاد آتا ہے سہارے ٹوٹ جانے پر

ہزاروں ٹھوکروں میں جستجوئے مرگ کرتے ہیں
وہ جن کو زندگی ملتی تھی تیرے آستانے پر

مسلسل نامرادی کا نتیجہ اور کیا ہوتا
محبت طنز بن کر رہ گئی آخر زمانے پر

معاف اے نوگرفتارو! مرے پَر نوچنے والے
مجھے مجبور کرتے تھے قفس کا در سجانے پر

میں کیوں اہلِ جہاں کی تُرش روئی کا بُرا مانوں
گراں خوابی میں جھنجلایا ہی کرتے ہیں جگانے پر

حفیظؔ بے نوا سے پُرسشِ احوال مت کرنا
وہ دُکھیارا نہ آجائے کہیں رونے رُلانے پر

کہاں یہ سطح پسندی ادب کو لے آئی
جہاں نظر کی بلندی نہ دل کی گہرائی

اب آدمی کا ٹھکانہ، نہ کائنات کی خیر
سُنا ہے اہلِ خرد ہو گئے ہیں سودائی

ہزار حیف کہ ہم تیرے بے وفا ٹھہرے
ہزار شکر کہ ہم کو ہَوَس نہ راس آئی

اب اپنے جیب و گریباں کا کیا سوال رہا
جنوں کا ہاتھ بٹانے کو خود بہار آئی

حیات پوچھ رہی تھی سکون کا مفہوم
تڑپ کے دل نے ترے درد کی قسم کھائی

اسی کی راہ میں آنکھیں بچھائے گی منزل
وہ عزم جو نہیں محتاجِ ہمّت افزائی

مشاعروں میں حفیظؔ آج کل وہی جائے
کہ جس کو حد سے زیادہ ہو ذوقِ رسوائی

یہ فلسفہ بھی ہے اور دل کا فیصلہ بھی ہے
سپردگی ہی نہیں، عشق میں انا بھی ہے

اگرچہ درد کی شدّت سے چیختا بھی ہے
تڑپنے والے میں جینے کا حوصلہ بھی ہے

سمجھ کے، سوچ کے ہم کو خوش آمدید کہو
ہمارے ساتھ مسائل کا قافلہ بھی ہے

زبانِ خلق کا یوں تو کچھ اعتبار نہیں
زبانِ خلق ہی نقّارۂ خدا بھی ہے

کچھ اہتمامِ خصوصی کی فکر کر ساقی
کہ آج رندوں کے ساتھ ایک پارسا بھی ہے

نہ کارزارِ جہاں میں، نہ خانقاہوں میں
جنابِ شیخ کہیں آپ کا پتہ بھی ہے؟

نیاز و ناز کی لذّت حفیظؔ سے پوچھو
خداشناس بھی ہے وہ خود آشنا بھی ہے
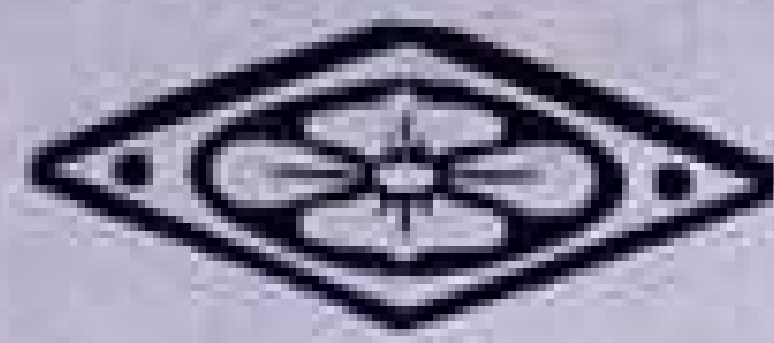
بے تابیاں ہیں اور نہ غمِ انتظار ہے
یہ اعتبار ہے کہ عدم اعتبار ہے

کیا عہد تھا کہ آپ کی نفرت بھی تھی عزیز
کیا وقت ہے کہ آپ کی الفت بھی بار ہے

تنہائی میں سُلگ نہ اُٹھیں پھر بجھے شرار
اے دل قیامِ بزم سے کچھ تو قرار ہے

سچ جان میں نے تیری تمنّا کبھی نہ کی
اور یوں ترے کرم کا تجھے اختیار ہے

آپ اور دعائے مرگِ جوانی بچشمِ تر
کیا تلخیِ حیات بہت ناگوار ہے؟

کافر سرورِ عشق تو تھا ہی مگر حفیظؔ
اس سے بھی کچھ لذیذ یہ ظالم خمار ہے

بادِ صبا! یہ ظلم خدارا نہ کیجیو
اس بے وفا سے ذکر ہمارا نہ کیجیو

غم کی کمی نہیں ہے جہانِ خراب میں
اے دل ترس ترس کے گذارا نہ کیجیو

بدتر ہے موت سے بھی غلامی کی زندگی
مرجائیو مگر یہ گوارا نہ کیجیو

اے صاحبِ عروج تو بامِ عروج سے
سورج کے ڈوبنے کا نظارا نہ کیجیو

ایسا نہ ہو کہ لوگ ہمیں پوجنے لگیں
اتنا بھی احترام ہمارا نہ کیجیو

ساحل اگر نصیب بھی ہو جائے، اے حفیظؔ
طوفاں سے بھول کر بھی کنارا نہ کیجیو

اُس عزم میں عظمت کی کوئی بات نہیں ہے
وہ عزم جو پروردۂ آفات نہیں ہے

اب کُھل کے کہو بات تو کچھ بات بنے گی
یہ دَورِ اشارات و کنایات نہیں ہے

رعنائیِ افکار و خیالات کا مطلب
عُریانیِ افکار و خیالات نہیں ہے

کچھ اوک سے پیتے ہیں تو کچھ جام بکف ہیں
ساقی تری محفل میں مساوات نہیں ہے

ملتے ہی کچھ اس طرح اُمڈ آئے ہیں آنسو
جیسے کہ یہ رخصت ہے ملاقات نہیں ہے

جُھک جُھک کے حفیظ آپ نہ آداب بجالائیں
یہ دادِ سخن ہے کوئی خیرات نہیں ہے
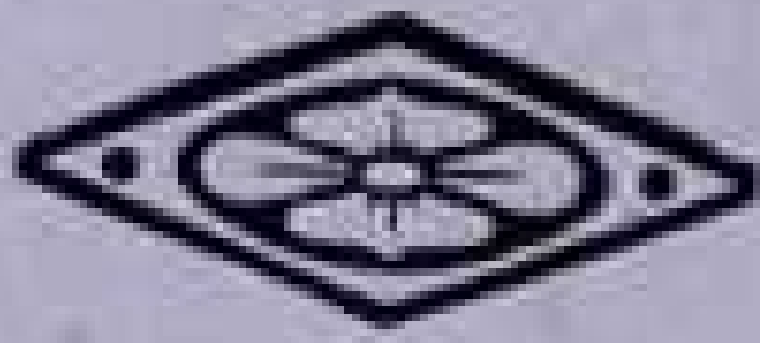
کیسی ہی مصیبت ہو بڑے شوق سے آئے
کم ظرف کے احسان سے اللہ بچائے

میں آج نئے عزم سے پَر تول رہا ہوں
کوئی مری پرواز کی راہوں میں نہ آئے

پھولوں کو تو سر خوب چڑھاتا ہے زمانہ
ہے کوئی جو کانٹوں کو بھی سینے سے لگائے

دامن کا کبھی غم ہے کبھی فکرِ گریباں
ہم ہوش میں آئے بھی تو کیا ہوش میں آئے

جس شاخ نے آغوش میں کلیوں کو کھلایا
اس شاخ نے پھولوں کے جنازے بھی اُٹھائے

رہتا ہے حفیظؔ اہلِ تکبر سے گریزاں
اس شاعرِ مغرور کو مُنہ کون لگائے
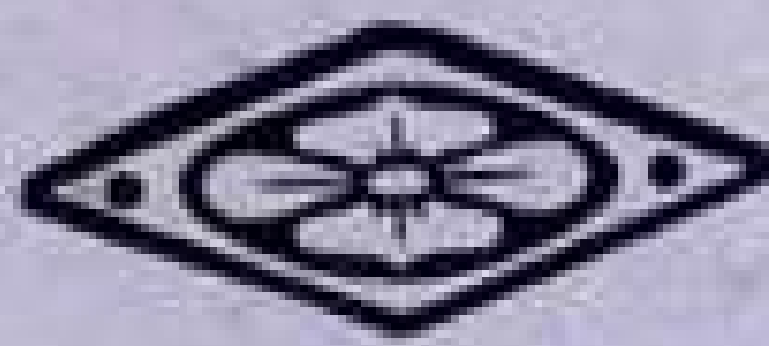
دار و رسن نے کس کو چُنا دیکھتے چلیں
یہ کون سر بلند ہوا؟ دیکھتے چلیں

آئے گا پھر چمن پہ تصرّف کا وقت بھی
پہلے قفس کی آب و ہوا دیکھتے چلیں

جاتے تھے ہم تو پھیر کے منہ جلوہ گاہ سے
لیکن دل و نظر نے کہا "دیکھتے چلیں"

تہذیبِ نو کے عہد میں انسانیت کے ساتھ
انساں نے کیا سلوک کیا؟ دیکھتے چلیں

ہاں اک نظر حفیظ پہ عبرت کے واسطے
کیا رہ گئی ہے قدرِ وفا دیکھتے چلیں

حاصل ہیں رہزنوں کی جو خدمات ان دنوں
رہبر بنا ہے قبلۂ حاجات ان دنوں

دامن نصیب ہے نہ گریباں نصیب ہے
کیسے کریں جنوں کی مدارات ان دنوں

اُترو نہ آسماں سے فرشتو! وہیں رہو
اچھے نہیں زمین کے حالات ان دنوں

اہلِ ہنر کی قدر بھی ان میں سے ایک ہے
ناپید ہو گئیں جو روایات ان دنوں

حل ہو تو کس طرح ہو کوئی مسئلہ حفیظؔ
چھائے ہوئے ہیں عقل پہ جذبات ان دنوں

وادیٔ حسن! ہم اس سیر و سفر سے گذرے
دل لرز اُٹھا وہ نظّارے نظر سے گذرے

راہ رو کے ہوئے خود راہنما بیٹھے ہیں
اب کوئی قافلہ گذرے تو کدھر سے گذرے

اُف یہ جادہ کہ جسے دیکھ کے جی ڈرتا ہے
کیا مسافر تھے جو اس راہ گذر سے گذرے

حُسنِ منزل کی قسم، زندگیِ دل کی قسم
رقص کرتے ہوئے ہم برق و شرر سے گذرے

کوئی چُپکے سے دِیا دل کا جلا کر سو جائے
کاروانِ مہ و انجم جب اِدھر سے گذرے

جانے کیا کہہ گئے ماحول سے، جاتے جاتے
وہ اندھیرے جو ابھی چاکِ سحر سے گذرے

کس کس انداز سے فطرت نے مجھے خوار کیا
کہیں مجبور بنایا کہیں مختار کیا

نیم باز آنکھوں سے یہ کیا نگہِ یار کیا
نہ تو معصوم ہی چھوڑا نہ گنہگار کیا

میں تو اس درد کے انجام سے تھراتا ہوں
جس کے آغاز نے تم کو مرا غمخوار کیا

ہائے مجبوریِ اُلفت کہ بایں سوز و گداز
ہم نے ہنس ہنس کے ترے عشق سے انکار کیا

رکھ لیا ہاتھ مرا اپنے دھڑکتے دل پر
میں نے جب عہدِ وفا کے لیے اصرار کیا

وہی دیوانہ سا، برباد سا، شاعر سا حفیظ
تم نے بھی کس کے لیے دل کو گرانبار کیا

شاعروں کے، نہ کسی اہلِ قلم کے ہاتھوں
آپ بدنام ہوئے اپنے ستم کے ہاتھوں

اس لیے راہزنوں سے میں بہت نادم ہوں
ان کو زحمت جو ہوئی میرے بھرم کے ہاتھوں

اپنے کشکول سے سر پھوڑ لیں ناداں اپنا
وہ جو برباد ہوئے دستِ کرم کے ہاتھوں

تب خیال آیا کہ میں جھوٹ کے بازار میں ہوں
زندگی بک گئی جب قول و قسم کے ہاتھوں

ہر ستایا ہوا ملتا ہے لپٹ کر مجھ سے
شخصیت میں یہ کشش آئی ہے غم کے ہاتھوں

سر بکف ہم جو بڑھے دین کی نصرت کو حفیظؔ
کفر کا فتویٰ لگا شیخِ حرم کے ہاتھوں

رنگ آنکھوں کے لیے، بو ہے دماغوں کے لیے
پھول کو ہاتھ لگانے کی ضرورت کیا ہے

اپنے دامن کے لیے خار چُنے خود ہم نے
اب یہ چُبھتے ہیں تو پھر ان سے شکایت کیا ہے

حور و جنّت کی تمنّا نہیں کرتا اب شیخ
جب سے دیکھا ہے کہ آغوشِ حکومت کیا ہے

لا مری سمت. بڑھا جامِ محبّت ساقی
میں نہ پوچھوں گا کہ انجامِ محبّت کیا ہے

ہائے کیا وقت پڑا ہے کہ مری مجبوری
مجھ سے یہ پوچھ رہی ہے تری قیمت کیا ہے

حق کی راہوں میں کہاں راحت و آرام حفیظؔ
ہم اگر ٹھوکریں کھاتے ہیں تو حیرت کیا ہے

بربادیاں بھی عشق میں بے فائدہ نہیں
اب آس پاس اہلِ ہوس کا پتہ نہیں

مقدور اگر دوا کا نہیں ہے دعا ہی کر
قسمت کا آسرا تو کوئی آسرا نہیں

کافی ہے صرف اپنے پرائے کا امتیاز
اس دورِ بے بصر میں کچھ اچھا بُرا نہیں

اللہ رے اس غریب تمنّا کی بے کسی
دل بھی کبھی جسے پہچانتا نہیں

تو اس سے بدگمان نہ ہو یہ ترا حفیظؔ
کتنا ہی بے نیاز سہی، بے وفا نہیں

کل رات جس نے میکدہ سر پر اُٹھا لیا
میرا جنونِ شوق تھا ساقی! وہ میں نہ تھا

وہ شرم ہے کہ گھر سے نکلنا محال ہے
سُنتا ہوں میرے شہر میں بیگانہ لُٹ گیا

یہ کیا مقام ہے کہ ہمارے کلام پر
تنقید کی گئی، نہ کوئی تبصرہ ہوا

تحسین و آفریں مرے دشمن کے وار پر
اللہ! میرے چاہنے والوں کو کیا ہوا

تر ہے گلابِ اشک سے ہر آستیں حفیظ
شاید مری زبان پہ ذکرِ جمیل تھا

میں غم غلط نہ کروں گا شراب سے ساقی
خطا معاف مجھے بے حسی پسند نہیں

سکوں میں درد کے پہلو تلاش کرتے ہیں
ہم ایسے لوگ جو آسودگی پسند نہیں

نہ ٹوٹ جائے کہیں خوش گمانیوں کا طلسم
کسی سے اس لیے وابستگی پسند نہیں

مرے حواس، مرا ہوش لوٹنے والے!
تجھے بھی کیا مری دیوانگی پسند نہیں

ہر اک زباں پہ ہے پیغام آشتی کا حفیظؔ
کوئی بھی دل سے مگر آشتی پسند نہیں

کہاں کے مالک و مختار ہم تو کچھ بھی نہیں
فریب دے نہ درِ یار ہم تو کچھ بھی نہیں

مری جھجک پہ وہ ساقی سے شیخ کا ارشاد
"بس اک یہی تو ہیں دیندار ہم تو کچھ بھی نہیں"

کہاں وہ گرمیِ گفتار "ہم ہی سب کچھ ہیں"
کہاں یہ سردیِ کردار "ہم تو کچھ بھی نہیں"

ادھر جو چھاؤں سی دیکھی تو آکے بیٹھ گئے
لرز نہ سایۂ دیوار! ہم تو کچھ بھی نہیں

نکالنا تھا چمن سے حفیظ کو پہلے
یہی ہے واقعی اک خار ہم تو کچھ بھی نہیں

نہ شوخیوں سے نہ سنجیدگی سے ملتی ہیں
وہ لذّتیں جو تری برہمی سے ملتی ہیں

جب اس کے غم کے سوا زیست کچھ نہیں ہوتی
وہ ساعتیں بڑی خوش قسمتی سے ملتی ہیں

نہیں ضرور کہ قربت ہو وصل کا حاصل
کہ دوریاں بھی تو وابستگی سے ملتی ہیں

دلِ تباہ مری بات کا خیال نہ کر
ملامتیں بھی تو ہمدرد ہی سے ملتی ہیں

نقابِ حسن کو جلووں سے مختلف نہ سمجھ
نظر کو دید کی راہیں اسی سے ملتی ہیں

جو درد و غم کی طلب ہے سنو کلام حفیظؔ
یہ بخششیں کسی محروم ہی سے ملتی ہیں

ستم کی تیغ یہ کہتی ہے سر نہ اونچا کر
پکارتی ہے بلندی کہ زندگی ہے اِدھر

چمن میں ہم نہ رہیں گے ترے پلٹنے تک
ٹھہر ٹھہر ذرا جاتی ہوئی بہار ٹھہر

مری جبیں پہ اُبھرنے لگے نقوشِ غرور
مرے سنوارنے والے مجھے تباہ نہ کر

کوئی فریب نہ کھائے سفید پوشی سے
نہ جانے کتنے ستارے نگل گئی ہے سحر

تو جوہری ہے تو زیبا نہیں تجھے یہ گُریز
مجھے پرکھ مری شہرت کا انتظار نہ کر

حفیظ کتنے ہی چہرے اُداس ہونے لگے
ہمارے فن کو سراہیں بہت نہ اہلِ نظر
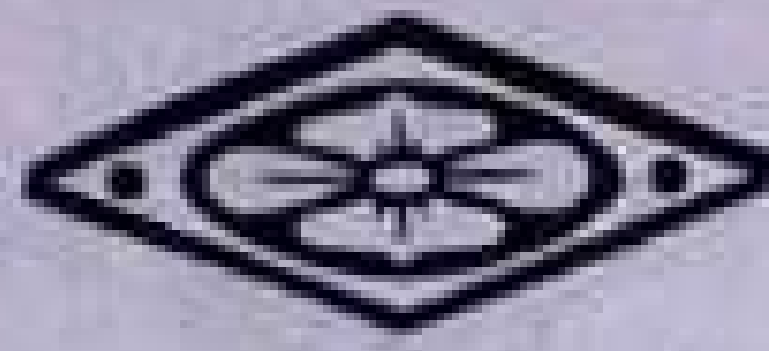
بشر سے ہو نہ سکا دردِ زیست کا درماں
بہت وسیع ہے کہنے کو عالمِ امکاں

میں سُن رہا ہوں تری دھڑکنیں مگر اے دل
غمِ جہاں سے الگ تو نہیں غمِ جاناں

کچھ اور ڈھونڈھ رہی ہے نگاہِ اہلِ نظر
نہ گیسوؤں کی گھٹائیں، نہ عارضِ تاباں

یہ ہلتے کانپتے کمزور ناتواں تنکے
ڈبو دیے اِنھی تنکوں نے سینکڑوں طوفاں

دریدہ پیرہنی پر بھی فقر جامہ زیب
ہوس ہزار طرح کے لباس میں عریاں

شگفتگی بھی ہے، تاثیر بھی، بصیرت بھی
پسند آئی تمھاری غزل حفیظ میاں

تمھارا خون بہا ہے جہاں تہاں لوگو
مگر یہ خون نہ جائے گا رائگاں لوگو

خُدا کا شُکر کہ محفل میں ذکرِ دار چھڑا
ہمیں تو آنے لگی تھیں جماہیاں لوگو

نکالنے ہیں تمھیں خود ہی پاؤں کے کانٹے
پلٹ کے تم کو نہ دیکھے گا کارواں لوگو

لگی تھی ٹھیس ہی کچھ تیز و تند لہجوں کی
بکھر کے رہ گئیں شیشہ مزاجیاں لوگو

بغیر معجزہ یوں پھُوٹتے نہیں چشمے
کوئی رگڑتا رہے لاکھ ایڑیاں لوگو

جو چاہتے ہو کہ تاریخ تابناک بنے
ملا دو خاک میں اپنی جوانیاں لوگو

وہیں وہیں نظر آیا ہے سر بلند حفیظ
پڑی ہے سر کی ضرورت جہاں جہاں لوگو

اس سے پہلے کس طرح اس کو کسی قابل کہیں
درد کو درماں بنا ڈالے تو دل کو دل کہیں

ظلم ہے یہ بھی سراسر یہ بھی اک توہین ہے
جانِ محفل کو اگر ہم رونقِ محفل کہیں

ایک ٹھوکر کی حقیقت کچھ نہیں یوں تو مگر
کھول دے آنکھیں تو ساری عمر کا حاصل کہیں

ڈھونڈتا پھرتا ہوں دنیا کے بھرے بازار میں
ایک معمولی سی شے جس کو سکونِ دل کہیں

ایک تو کشتی ڈبو دی ناخدا نے اور پھر
اِس پہ اُترا ہے کہ ہم گرداب کو ساحل کہیں

بھر نہ آئے جو کسی کی بے کسی پر اے حفیظؔ
اُس کو کیسے آنکھ کہہ دیں اُس کو کیونکر دل کہیں

جُرم کیا سنگین ایسا ہو گیا ان سے کوئی
پتّھروں سے توڑتا پھرتا ہے آئینے کوئی

عقل والے تو سمجھ لیتے ہیں دل والوں کی بات
عقل کے ماروں کو لیکن کیسے سمجھائے کوئی

آج خود اپنی غرض سے اس کے گھر جاتا ہوں میں
کل بُلاتا رہ گیا مجھ کو محبّت سے کوئی

کتنے چہروں کی بشاشت کا ہے اس پر انحصار
میری مصنوعی خوشی کی قدر کیا جانے کوئی

یونہی مت کر لیجیے احسان کے تحفے قبول
جانے کس احسان کے بدلے میں کیا مانگے کوئی

جان تک دے دی وفا کی راہ میں ہم نے حفیظؔ
کیا کریں پھر بھی اگر ہم کو نہ پہچانے کوئی

نظر پہ کیوں ہیں مناظر گراں نہیں معلوم
یہ رونقیں ہیں کہ ویرانیاں نہیں معلوم

خرد کی بات پہ ہنس کر گزر بھی جا اے دل
خرد کو فرقِ یقین و گماں نہیں معلوم

تمام راہ لہو میں ہے غرق اے منزل
کہاں تک آئے تھے سود و زیاں نہیں معلوم

خبر نہیں کہ گرے ہیں کہاں کہاں آنسو
کدھر کدھر سے اُٹھے گا دھواں نہیں معلوم

حفیظؔ ہم تو روانہ ہوئے خدا حافظ
قدم اُٹھائے گا کب کارواں نہیں معلوم

ہٹا ہٹا کے مقاماتِ این و آں سے مجھے
قریب کر دیا دل نے اس آستاں سے مجھے

حیات و موت کرشمے ہیں ان کی شوخی کے
کبھی یہاں سے پکارا کبھی وہاں سے مجھے

جو اُن کے مُنہ سے جھڑے تھے وہ پھول روک لیے
گلہ رہے گا یہ دامانِ کہکشاں سے مجھے

فرازِ ناز، نشیبِ نیاز، سطحِ گداز
تباہیوں نے پکارا کہاں کہاں سے مجھے

یہ پُرخلوص فضائیں کہاں ملیں گی حفیظؔ
اُٹھا نہ اہلِ محبّت کے درمیاں سے مجھے
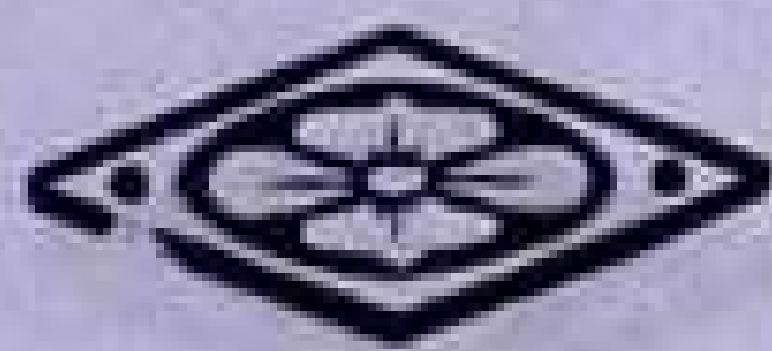
ہائے اس دوریِ منزل پہ یہ اندازِ خرام
کارواں موجِ رواں، سیلِ رواں ہوجاتا

یہ بھی اچھا ہوا تجھ پر نہ کھلا رازِ حیات
سانس کہتے ہیں جسے نشترِ جاں ہوجاتا

مٹ گیا باغ سے ناموسِ خودی کی خاطر
گل کہاں رہتا جو ہم رنگِ خزاں ہوجاتا

اک طرف موت ہے اک سمت ہے توہینِ حیات
ہاں تو پھر فیصلۂ سود و زیاں ہوجاتا

جوہرِ فن بھی کوئی شے تھی نمائش کی حفیظؔ
تم عیاں کرتے نہ کرتے یہ عیاں ہوجاتا

اپنی آنکھوں سے لہو اپنا جگر دیکھ لیا
جو کچھ آیا تری محفل میں نظر دیکھ لیا

ایک بار آیا تھا تعمیرِ نشیمن کا خیال
ہر طرف سلسلۂ برق و شرر دیکھ لیا

اتنا ہی جانیے اس دور میں مفہومِ سکوں
جان سی آگئی جب دوش پہ سر دیکھ لیا

جگمگانے لگے ذرے تو ستارے نہ رہے
تیرا اندھیر بھی اے نورِ سحر دیکھ لیا

یہ دل و جان تو اک جام کی قیمت بھی نہیں
ہائے کیا ہوگا جو ساقی نے ادھر دیکھ لیا
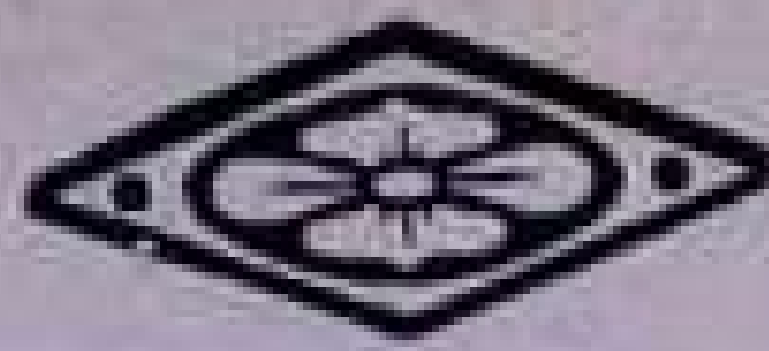
ہوا قدرداں اس قدر تو زمانہ
کہ جس کی سپر ہوں اسی کا نشانہ

مجھے دوستی کی قسم دینے والے!
مری دشمنی بھی نہیں دشمنانہ

نہ پڑ ماضی و حال کی الجھنوں میں
صداقت نہیں ہے اسیرِ زمانہ

بہت اس سے اونچی ہے پرواز میری
میں ہرگز نہیں بندۂ آب و دانہ

اُس اک مرکزِ دین و دنیا سے ہٹ کر
نہ میرا ٹھکانہ، نہ تیرا ٹھکانہ

کوئی مرحلہ ہو، کوئی معرکہ ہو
نظر عارفانہ، قدم غازیانہ

حفیظؔ اس میں کردار کی جھلکیاں ہیں
نہیں شاعری یہ فقط شاعرانہ

آخرش چوٹ کھا گئی دنیا
اپنی ہی زد میں آ گئی دنیا

آدمی نے کب آنکھ کھولی ہے
آہ جب مٹ مٹا گئی دنیا

ہم ابھی جُرم بھی سمجھ نہ سکے
فیصلہ بھی سُنا گئی دنیا

رات کو رات کہہ دیا میں نے
سُنتے ہی بوکھلا گئی دنیا

ساتھ چلنا تو خیر مشکل تھا
روکنے سے بھی کیا گئی دنیا

تجھ سے پھیرا تری قسم دے کر
کیا کروں بھید پا گئی دنیا

کس نے سمجھا ہے میرے غم کو حفیظؔ
گد گدا کر رُلا گئی دنیا

کتنے اہلِ ہوش کس کس طرح بہکانے اُٹھے
آپ کے کوچے سے اُٹھنے تھے نہ دیوانے اُٹھے

رنج و راحت کا وہ یوں مفہوم سمجھانے اُٹھے
راہ میں کانٹے بچھا کر پھول برسانے اُٹھے

ظرفِ ساقی ہی نہ جب دیکھا تو پھر کیا بیٹھتے
آنسوؤں سے بھر کے ہم آنکھوں کے پیمانے اُٹھے

آج کی بدحال دنیا کے بھی دن پھر جائیں گے
اے مورّخ ہم اگر تاریخ دُہرانے اُٹھے

غمگسار آئیں نہ آئیں بزم برپا ہو نہ ہو
دل جلوں سے دل جلے کہہ سُن کے افسانے اُٹھے

اب خدا حافظ متاعِ دین و دانش کا حفیظ
واعظِ کج فہم بھی تقریر فرمانے اُٹھے
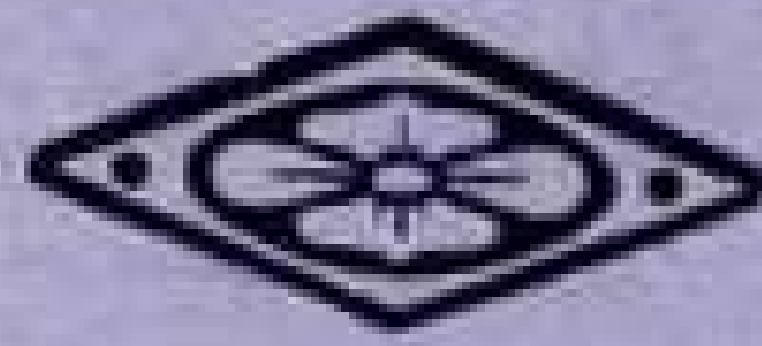
کھینچ کر بازار میں شہرت کے لے آیا مجھے
آہ میرا قدرداں بھی کب سمجھ پایا مجھے

جُرم ہے جس پر ترس کھانا وہ دکھیا راہوں میں
کیوں بُلاتا ہے کسی دیوار کا سایا مجھے

میں نے کس در پر عقیدت سے جبیں سائی نہ کی
کون سے در نے حقارت سے نہ ٹھکرایا مجھے

جراُتِ عرضِ تمنّا پر مسرّت بھی ہوئی
ساتھ ہی خودداریوں پر رحم بھی آیا مجھے

یہ بھی کیا اے غمگسارو! مجھ سے چِھن جانے کو ہے
زندگی پر آج اتنا پیار کیوں آیا مجھے؟

چارہ سازی کی تو فرصت کس کو ہے لیکن حفیظؔ
دوستوں کا طرزِ دلجوئی پسند آیا مجھے

کوئی بھی پیش نہیں آتا مہرباں کی طرح
جہاں میں ہوں کسی ناخواندہ میہماں کی طرح

یہ واجبی سے سہارے نہ کام آئیں گے
ہمیں اُٹھائے کوئی نازِ دوستاں کی طرح

یہ کس بہارِ بداماں چمن میں آگ لگی
مہک رہا ہے دھواں زلفِ دلبراں کی طرح

میں اپنے دَور کی رودادِ بربریت بھی
سُنا رہا ہوں محبّت کی داستاں کی طرح

متاعِ آخرِ شب ہیں بچے کُھچے تارے
بساطِ چرخ پڑی ہے لُٹی دُکاں کی طرح

سفر کے نام سے چیں بر جبیں رہے جو لوگ
وہ منزلوں پہ ملے میرِ کارواں کی طرح

ہمارا جذبۂ تعمیر دیکھ لے دُنیا
سجا رہے ہیں قفس کو بھی آشیاں کی طرح

کچھ اس ادا سے چمن کا شعور جاگا ہے
کلی کلی نظر آتی ہے باغباں کی طرح

کیا جانے کیا سبب ہے کہ جی چاہتا ہے آج
روئے ہی جائیں سامنے تم کو بٹھا کے ہم

اب انتہائے ضبط نے دل میں لگائی آگ
بیٹھے تھے آنسوؤں کی بغاوت دبا کے ہم

کیسا خیال، کس کی محبّت، کہاں کا عشق
یوں ہی جھجک گئے تھے ترے پاس آ کے ہم

سچ ہے کبھی کی رات بڑی اور کبھی کے دن
جاتے ہیں تیرے ہاتھ سے دامن چھڑا کے ہم

حُسنِ جنوں نواز کا پایا جو التفات
مستی میں آ کے موت سے ٹکرا گئی حیات

اے محوِ انتظار! ستارے نہیں ہیں یہ
ہنستی ہے تیری سادہ دلی پر اندھیری رات

بے مہریاں بڑھی ہیں زمانے کی جس قدر
اتنی ہی یاد آئی ہیں ان کی نوازشات

طے کیجیے گا دار پہ کہنا ہے کیا حفیظؔ
اک بُزدلی کی بات ہے اک مردمی کی بات

کس جگہ بیٹھیں بھلا ہم چین سے آرام سے
کوئی گوشہ بھی نہیں خالی تمھارے دام سے

اے گھٹا کہیو سلامِ شوق خاص و عام سے
میکشوں سے، مے سے، ساقی سے، سبو سے، جام سے

ہل گیا مستوں کی ہاؤ ہو سے مے خانہ مگر
ایک قطرہ بھی نہیں چھلکا کسی کے جام سے

کون کہتا ہے ہمارے دوستوں میں تھا حفیظؔ
کیا تعلّق ہم کو اُس برباد سے ناکام سے

حوصلوں کو دھمکیاں دیتی ہوئی موجیں ملیں
پھر وہی رہزن نظر آئے وہی راہیں ملیں

اور کیا ملتا ہمیں اس دور کے احباب سے
دل شکن فقرے ملے، طعنے ملے، چوٹیں ملیں

آگیا جب سامنے تقدیر کا لکھا ہوا
سب جلا ڈالیں تری جتنی بھی تحریریں ملیں

سب ہماری خیر خواہی کے علمبردار تھے
سب کے دامن پر ہمارے خون کی چھینٹیں ملیں

اب سوئے شہر جائے کہ صحرا کا رُخ کرے
ہم نے تو دل کو چھوڑ دیا اس کے حال پر

اُن کی جبینِ ناز پہ جس سے شکن پڑے
پابندیاں ہیں آج ہر ایسے خیال پر

کیوں بار بار دیکھتے ہیں آپ آئنہ
کیا شک ہے آپ کو مرے ذوقِ جمال پر

پہنچا ہے جن کے ہاتھوں سے اس حال کو حفیظؔ
آنسو بہا رہے ہیں وہی اُس کے حال پر

اسیروں کے لیے سوغات ہوگی
ہمیں کانٹے ہی بھجوا دو چمن سے

وطن سے دور یوں لگتا ہے جیسے
کوئی آواز دیتا ہو وطن سے

زمانہ آپ ہو جائے گا واقف
ہماری شخصیت سے، فکر و فن سے

حفیظؔ اِس میں کسی کا کیا اجارہ
ہوا گر شیخ بیعت برہمن سے

جان کر بھی آج ساقی نے نہیں جانا ہمیں
وقت آئے گا کہ پہچانے گا میخانہ ہمیں

زندگی بھی ہم نہ لیں گے بے ادب کے ہاتھ سے
قتل بھی منظور ہے اپنا شریفانہ ہمیں

آگ ہم گھر کو لگا کر شہر سے نکلے تو ہیں
یہ بھی ممکن ہے کہ اپنائے نہ ویرانہ ہمیں

کِھل اُٹھیں گے پھول کی مانند ہم حرماں نصیب
تُم صبا کی طرح بس چھو کر گزر جانا ہمیں

طالبِ لُطف کرم ہو جب کوئی اہلِ ہَوَس
ساقیِ محفل نظر انداز کر جانا ہمیں

مرثیوں، سہروں، قصیدوں کے تقاضے ہیں حفیظ
قدر دانوں نے ہمارے خوب پہچانا ہمیں

اسی میں کچھ فراقِ یار کی گھڑیاں گذر جاتیں
کہاں ہیں؟ آج ناصح بھی تو سمجھانے نہیں آئے

گُلوں سے داغ، کانٹوں سے خلش لینے کو آئے ہیں
گلستاں میں ہم اپنے دل کو بہلانے نہیں آئے

ابھی کیا ہے کل اک اک بوند کو ترسے گا میخانہ
جو اہلِ ظرف کے ہاتھوں میں پیمانے نہیں آئے

کبھی جب امتیازِ حقّ و باطل کا سوال آیا
ہمارے سامنے پھر اپنے بیگانے نہیں آئے

جمودِ زندگی میں بے پئے ہلنا بھی مشکل تھا
جہادِ زندگی میں یاد میخانے نہیں آئے

گلے مجھ کو لگا کر وہ کسی کا ناز سے کہنا
"حفیظِ بے وفا ہم تجھ کو اپنانے نہیں آئے"

وہ خود بڑا تھا مگر دل بڑا نہ تھا اس کا
مجھے ملا جو سمندر سراب جیسا تھا

گذار کر تو دکھائے مری طرح کوئی
ترس رہا تھا مگر فیضیاب جیسا تھا

ٹلی ہے سر سے نحوست خدا خدا کر کے
یہ دورِ عیشِ فراواں عذاب جیسا تھا

شریکِ بزم تھا لیکن نظر جھکائے ہوئے
وہ بے حجاب نہ تھا بے حجاب جیسا تھا

عجیب اس کی ملاقات نے اثر چھوڑا
سحر کا رنگ شبِ ماہتاب جیسا تھا

کسی نے اُس سے کبھی حرفِ برہمی نہ سُنا
بس اک سکوت ہی اس کا عتاب جیسا تھا

ہمارے آگے نہ کیجے حفیظؔ کی تعریف
ہمیں خبر ہے وہ خانہ خراب جیسا تھا

خطا ہے کس کی؟ اگر بے وقار گزرے ہیں
وہ ہو کے اپنی انا کا شکار گزرے ہیں

ہنسی نہ آئی ہنسانے ہے غم کے ماروں کو
طبیعتوں پہ لطیفے بھی بار گزرے ہیں

سحر نے زخم دیے، شام نے نمک چھڑکا
اسی طرح مرے لیل و نہار گزرے ہیں

بزعمِ خود جو مہذّب بھی، حق شناس بھی تھے
صداقتوں پہ اُڑاتے غبار گزرے ہیں

گھروں سے تا درِ زنداں وہاں سے مقتل تک
ہر امتحاں سے ترے جاں نثار گزرے ہیں

یہ کیا مقام ہے اے اہلِ آگہی جس سے؟
جُنوں کی کھا کے قَسَم ہوشیار گزرے ہیں

حفیظ تُو جنھیں جانِ وفا بتاتا تھا
ترے قریب سے بیگانہ وار گزرے ہیں

ہر سکوں کی تہ میں سو آتش فشاں رکھتا ہوں میں
ضبط کا اک رُخ نمایاں اک نہاں رکھتا ہوں میں

اے پرستارانِ نغمہ! چھوڑ کر تارِ رباب
آج کچھ دُکھتی رگوں پر انگلیاں رکھتا ہوں میں

ہائے رے نیرنگیاں ہوں تو چراغ اب بھی مگر
روشنی رکھتا تھا پہلے اب دھواں رکھتا ہوں میں

آج تک گذری اجل کی آرزو میں زندگی
زندگی سے آج بھی دلچسپیاں رکھتا ہوں میں

مجھ سے کب ہوتی بھلا پابندیِ رسمِ وجود
ان کی دلداری کی خاطر جسم و جاں رکھتا ہوں میں

ہیچ ہیں میری نظر میں آشیان و گلستاں
آدمی ہوں عزمِ تعمیرِ جہاں رکھتا ہوں میں

اب بھی وہ اپنا سمجھ کر مجھ کو اپنا لیں حفیظؔ
کون جانے ورنہ پھر یہ سر کہاں رکھتا ہوں میں

پکارا ہے اِنھیں شاید قضا نے
پرندے جھیل پر آئے نہانے

ہمارا راستہ جس نے بھی روکا
اُسے شاباشیاں دیں رہنما نے

ستم کو وہ کرم ثابت کریں گے
ذہانت ان کو بخشی ہے خُدا نے

اُٹھی کردار کی جب پاسبانی
ہوئے بدنام باعزّت گھرانے

کہو کچھ تو کہو، خاموش کیوں ہو؟
بہت ہیں بے وفائی کے بہانے

نہیں لیتے غریبوں کے سلام اب
اُنھیں چونکا دیا ہے التجا نے

وہ دیکھو آ گئے رہبر ہمارے
ہمیں آدابِ مظلومی سکھانے

ہنسی ہنسی میں تمھارے جو وار ہوتے ہیں
ستمگری کے وہی شاہکار ہوتے ہیں

ہم ایسے لوگوں سے کیوں دور دور رہتے ہو
ہم ایسے لوگ تو یاروں کے یار ہوتے ہیں

سُنائی پھر نہیں دیتی ضمیر کی آواز
دلوں پہ جب سرو ساماں سوار ہوتے ہیں

یہی ہوا ہے کہ اندر سے داغ داغ ملے
وہ، دیکھنے میں جو باغ و بہار ہوتے ہیں

گُمان جن کا تصوّر بھی کر نہیں سکتا
یقیں کے پاس وہ مردانِ کار ہوتے ہیں

ذلیل کرتے ہیں خود تبصرہ نگاروں کو
وہ تبصرے جو فقط اشتہار ہوتے ہیں

قیاس کیجیے کتنا بُرا زمانہ ہے
حفیظ جی بھی بھلوں میں شمار ہوتے ہیں

کون کہتا ہے کہ محرومی کا شکوہ نہ کرو
ہاں مگر ساقیِ میخانہ کو رُسوا نہ کرو

ذکر چھڑ جائے اگر قوم کی بدبختی کا
رہنماؤں کی طرف کوئی اشارا نہ کرو

ذہن سنجیدہ مسائل سے ہٹانے کے لیے
روز یہ شیخ و برہمن کا تماشا نہ کرو

ایک بھی لفظ ہٹانے کی نہیں گنجائش
میرے پیغامِ محبّت کا خلاصہ نہ کرو

یہ تعلّق کی خراشیں بھی مزا دیتی ہیں
روٹھ جائے کوئی تم سے تو منایا نہ کرو

اب میں خوابوں سے حقیقت کی طرف جاتا ہوں
میرے ارمانوں کی لاشو مرا پیچھا نہ کرو

آج بھی میں نہیں انسان سے مایوس کہ جب
لوگ کہتے ہیں خدا پر بھی بھروسہ نہ کرو
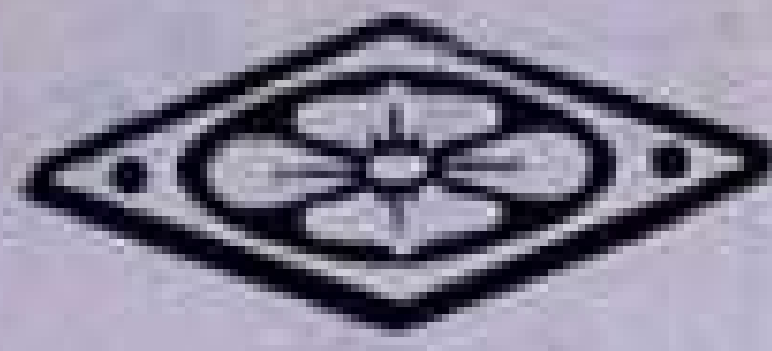
یہ کمالِ سادگی ہے کہ مقامِ بے نیازی
مرا کھیل سنگ باری، مرا کام شیشہ سازی

کوئی ہوش سے گریزاں، کوئی جوش سے گریزاں
وہ جنوں کی حیلہ سازی، یہ خرد کی حیلہ سازی

تری لاش خوں سے رنگیں، تری تیغ خوں سے رنگیں
بایں واقعاتِ خونیں، نہ شہید تو نہ غازی

یہ خلوص ہی کی نعمت، ہے شریعتوں کی عصمت
جو یہ ہو تو دین داری، یہ نہ ہو تو دین بازی

میں قدامتوں سے توبہ تو ہزار بار کرلوں
مگر اِس جدیدیت کا کوئی وصفِ امتیازی؟

کبھی فخرِ میکدہ تھے جو وہی حفیظؔ صاحب
سرِ بزم دینے آئے ہمیں درسِ پاکبازی

جنابِ شیخ سے آداب چھوٹے پارسائی کے
مسلمانوں میں چرچے ہیں تری کافرادائی کے

بڑے لوگوں کو جانے کیوں بُرا محسوس ہوتا ہے
نظر آتے ہیں جب آثار چھوٹوں میں بڑائی کے

ہمارا ذوق تو دیکھو، ہمارا ظرف تو دیکھو
ہم اپنے آپ کو دیتے ہیں طعنے بے وفائی کے

وہ طوفاں سر جُھکا کر آپ ہٹ جاتے ہیں راہوں سے
جو تیور دیکھ لیتے ہیں تمھاری ناخدائی کے

مقامِ شکر ہے یا جائے شکوہ کیا کہا جائے
توجہ میں تری انداز ہیں بے اعتنائی کے

حفیظ اب وہ مری حق گوئی پر تنقید کرتے ہیں
مرے احباب کو دعوے تھے میری ہمنوائی کے
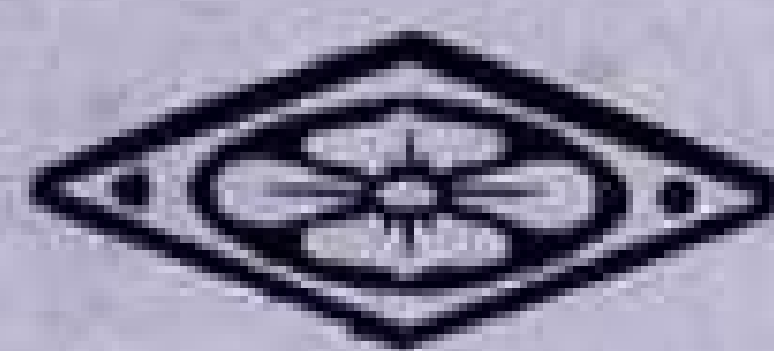
وہ طرزِ سخن میرا ظریفانہ سمجھ کر
ہنستے رہے شکوے کو بھی شکوہ نہ سمجھ کر

اپنے جو بہت خاص تھے دشمن سے ملے تھے
ہم ہار گئے جنگ کا نقشہ نہ سمجھ کر

ہلکا سا یہ اک فرق دلوں میں جو پڑا ہے
پچھتاؤ گے اس زخم کو گہرا نہ سمجھ کر

گھر ہی میں لیے بیٹھے رہے اپنا ہُنر ہم
اِس جنس کو بازار کا سودا نہ سمجھ کر

یہ اپنی نئی نسل حفیظؔ آپ کی باتیں
سُن لیتی ہے ارشادِ بزرگانہ سمجھ کر

اُف رے شکایتِ جفا، واہ رے شکوۂ ستم
ہنستے رہے حضور میں، رو دیے دور جا کے ہم

دستِ ہوس میں سیف ہے، جہل کے ہاتھ میں قلم
معرکۂ حیات میں رہ گئے خالی ہاتھ ہم

ہائے یہ کیا مقام ہے، ہائے یہ کیا نظام ہے
عشق کی آستیں بھی نم، حُسن کی آستیں بھی نم

ایسا بھی انقلاب کیا، شیخ تمھیں یہ کیا ہوا
رُخ تو ہے سوئے بُتکدہ، پشت ہے جانبِ حرم

شاید اُسی طرف سے کچھ، لُطف میں ہو گئی کمی
جانب کوے دوست جو آج نہ اُٹھ سکے قدم

کسی جبیں پر شکن نہیں ہے کوئی بھی مجھ سے خفا نہیں ہے
بغور میرا پیام شاید ابھی جہاں نے سُنا نہیں ہے

سفینۂ عہدِ نو پہ چھایا ہوا ہے بہروپیوں کا لشکر
یہاں ہر اک ناخدا نما ہے مگر کوئی ناخدا نہیں ہے

خیال کے دیوتا بھی جھوٹے عمل کے سب سورما بھی جھوٹے
خرد بھی فریاد رس نہیں ہے جنوں بھی مشکل کشا نہیں ہے

ہر ایک میکش کے ظرف سے باخبر ہے کتنی نگاہِ ساقی
کسی کو ہے حکمِ جاں نثاری، کسی کو اذنِ وفا نہیں ہے

کہاں کا شاعر خدائے شعر و سخن بھی ہم اس کو مان لیتے
حفیظؔ میں یہ بڑی کمی ہے کہ بندۂ خود نما نہیں ہے
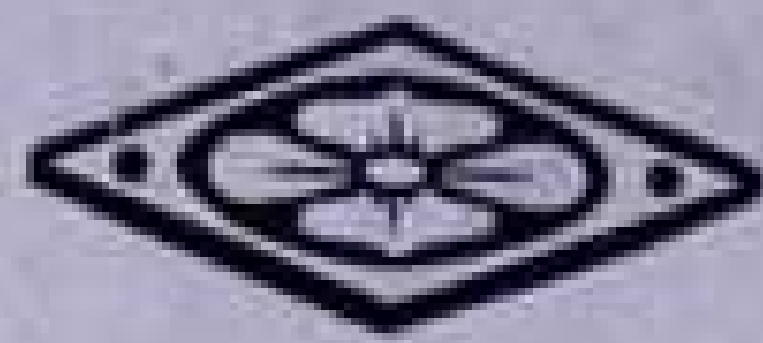
تیری مقدّس یاد بخیر لاکھ ہو دورِ حرص و آز
عہدِ وفا نے روک لیا جب بھی ہوس نے دی آواز

کوئی کہاں تک جانے گا، کوئی کہاں تک سمجھے گا
ہر قطرہ بحرِ اسرار، ہر ذرّہ دنیائے راز

لال نہیں ہے کس کا مُنہ اس دورِ خونخواری میں
جیسے جس کے بازو ہیں ویسی ہی اس کی پرواز

بلبل کے نغموں پہ نہ جا، گل کی رنگینی مت دیکھ
میرا افسانہ مجھ سے سُن، میں خود ہوں اپنی آواز

بزمِ طرب میں آج ذرا ہم بھی ہوئے تھے نغمہ سرا
لیکن ایسی چیخوں کی ساز سے کیا ملتی آواز

بے سہاروں کا انتظام کرو
یعنی اک اور قتلِ عام کرو

خیر خواہوں کا مشورہ یہ ہے
ٹھوکریں کھاؤ اور سلام کرو

دب کے رہنا ہمیں نہیں منظور
ظالمو جاؤ اپنا کام کرو

سرپھروں میں ابھی حرارت ہے
اِن جیالوں کا احترام کرو

خواہشیں جانے کس طرف لے جائیں
خواہشوں کو نہ بے لگام کرو

میزبانوں میں ہو جہاں اَن بَن
ایسی بستی میں مت قیام کرو

آپ چھٹ جائیں گے ہَوَس والے
تم ذرا بے رُخی کو عام کرو

ڈھونڈھتے ہو گروں پڑوں کو کیوں
اُڑنے والوں کو زیرِ دام کرو

دینے والا بڑائی بھی دے گا
تم سمائی کا اہتمام کرو

بد دعا دے کے چل دیا وہ فقیر
کہہ دیا تھا کہ کوئی کام کرو

یہ ہُنر بھی بڑا ضروری ہے
کتنا جُھک کر کِسے سلام کرو

سانپ آپس میں کہہ رہے ہیں حفیظؔ
آستینوں کا انتظام کرو

جانے کیا شے ہے وہ نظر بھی
وجہِ سکوں بھی، غارت گر بھی

کانٹا کانٹا راہِ وفا کا
راحتِ دل بھی جانِ جگر بھی

عشق نہ جب تک روحِ رواں ہو
دل بھی ہے بیکار، نظر بھی

اُف کتنی بے درد ہے دنیا
ہنستی ہے چیخیں سُن کر بھی

عقل کے احسانات مُسلّم
عقل ہے لیکن غارت گر بھی

ہم توجّہ کے سزاوار نہ تھے
سیدھے سادے تھے اداکار نہ تھے

ہم سے کیوں بچ کے زمانہ گزرا
ہم کوئی سنگ نہ تھے خار نہ تھے

اس لیے گر گئے نظروں سے تری
ہم ترے حاشیہ بردار نہ تھے

اِن کو تو چارہ گروں نے مارا
اتنے بیمار یہ بیمار نہ تھے

دیکھتے رہ گئے حق دار سبھی
لے اڑے چند جو حق دار نہ تھے

بات منصب سے نہ دولت سے بنی
کیونکہ ہم صاحبِ کردار نہ تھے

پاس آکر بھی کوئی کیا لیتا
ہم کوئی سایۂ دیوار نہ تھے

خوفِ رسوائی سے پیچھا چھوٹا
دشت میں کوچہ و بازار نہ تھے

مول پانی کے بکا خونِ جگر
مطمئن پھر بھی خریدار نہ تھے

ہم تھے رندوں کے بھی غمخوار حفیظؔ
یہ الگ بات کہ مے خوار نہ تھے

اندھیروں سے ڈرے کیوں دل ہمارا
بہت روشن ہے مستقبل ہمارا

شہیدِ جستجو ہو کر تو دیکھیں
پتہ پوچھے گی خود منزل ہمارا

نہ دیکھیں گے چمن برباد ہوتے
کہ اس میں خون ہے شامل ہمارا

ضروری ہے کفن بردوش رہنا
وطن ہے کوچۂ قاتل ہمارا

ضمیروں کو چبھن بخشی ہے ہم نے
اثر ہوتا نہیں زائل ہمارا

ہماری مُعترف دل سے قدامت
دماغِ عصرِ نو قائل ہمارا

اِدھر طوفاں سے ہم دست و گریباں
اُدھر ہے منتظر ساحل ہمارا

کہیں زخمی ہیں ہم تیغِ ستم کے
کہیں قاتل ہے خود بسمل ہمارا

بدی سے برسرِ پیکار ہیں ہم
ہدف ہے ہر جگہ باطل ہمارا

ہمیں روکے گی کیا دیوارِ تہمت
محرّک ہے خلوصِ دل ہمارا

ہمارے آنسوؤں کو التجا کو
ترستا رہ گیا قاتل ہمارا

تخریب کی زد میں جب تعمیر نظر آئی
تدبیر پرستوں کو تقدیر نظر آئی

افکار کے دھارے کو کس بند نے روکا ہے
کب وقت کے پاؤں میں زنجیر نظر آئی

ہم کو تو اٹھا لائی اُس بزم سے خودداری
جب اُن کی توجہ میں تاخیر نظر آئی

الفاظ کے پھولوں نے نشتر کی چبھن دی ہے
لہجے میں ذرا بھی جب تحقیر نظر آئی

سادہ سی مری بستی جو حُسن سے عاری ہے
پردیس سے لوٹا تو کشمیر نظر آئی

مچلے ہیں حفیظ اپنے ارمان اسیری کے
جب کوئی قرینے کی زنجیر نظر آئی

اس میں کچھ لطف نہ آیا جو بہاروں میں کٹی
وہ مزا دے گئی جو زندگی خاروں میں کٹی

آستینوں میں چھپائے ہوئے خنجر تھے یہی
دشمنوں میں نہیں گردن مری یاروں میں کٹی

زندگی کو بڑی امیدیں ہیں مستقبل سے
وہ ستاروں پہ بھی گذرے گی جو غاروں میں کٹی

یہ ہے اپنا، یہ پرایا ہے، یہ دشمن ہے، یہ دوست
عمر انسان کی ایسے ہی حصاروں میں کٹی

عیش سامانیاں کیا جانے کدھر لے جاتیں
خیر گذری کہ حفیظؔ اپنی گذاروں میں کٹی

یہ بات نرالی دلِ خود دار کرے ہے
تڑپے ہے مگر درد سے انکار کرے ہے

دنیا کا یہ انداز سمجھ میں نہیں آتا
دیکھے ہے حقارت سے کبھی پیار کرے ہے

تسلیم اسے کوئی بھی دل سے نہیں کرتا
وہ فیصلہ جو جبر کی تلوار کرے ہے

اس دشمنِ ایماں نے کیا شیخ پہ جادو
کافر جو کہے ہے وہی دیندار کرے ہے

اب اپنے بھی سائے کا بھروسہ نہیں یارو!
نزدیک جو آئے ہے وہی وار کرے ہے

تقریر سے ممکن ہے نہ تحریر سے ممکن
وہ کام جو انسان کا کردار کرے ہے

شرماتا ہوں فنکار سمجھتے ہوئے خود کو
جب جھوٹی خوشامد کوئی فنکار کرے ہے

یہ ناچتی گاتی ہوئی اس دَور کی تہذیب
کیا جانئے کس کرب کا اظہار کرے ہے

مانگے ہے حفیظؔ اور ہی کچھ شعر کا بازار
کچھ اور طلب شعر کا معیار کرے ہے

کھینچ بھی ڈالیے رگ رگ سے لہو
یوں پیالہ نہ بھرے گا صاحب

شوق سے آپ قیامت ڈھائیں
کوئی اُف تک نہ کرے گا صاحب

برف بن جائیں گے آخر سب لوگ
برف پر رقص کرے گا صاحب

مجھ کو مظلوم سے ڈر لگتا ہے
یہ مجھے قتل کرے گا صاحب

تبصرہ کیا کریں اب اپنے طرفداروں پر
ہم کو دروازوں کا دھوکا ہوا دیواروں پر

حاکمِ شہر ہوا جان کا دُشمن یارو!
اور تنقید کرو حاشیہ برداروں پر

شدّتِ برہمیٔ پیرِ مغاں کیا کہیے
پارسائی کا بھی الزام ہے میخواروں پر

جب کسی اہلِ نظر نے کہیں آنکھیں کھولیں
بجلیاں ٹوٹ پڑیں وقت کے اندھیاروں پر

سلسلہ چھیڑ دیا دست درازی کا حفیظؔ
کس کا سایہ پڑا تہذیب کے معماروں پر

اِس دَورِ بے ضمیر میں جینا سکھا دیا
حالات نے ہمیں بھی منافق بنا دیا

جب اس نے میرے فن کا مجھے واسطہ دیا
اک نام اپنی نظم سے میں نے ہٹا دیا

جینے ہی دے مجھے نہ وہ مرنے ہی دے مجھے
خنجر چلا دیا کبھی مرہم لگا دیا

پھر داغدار ہو گیا دامانِ گلستاں
لو آج پھر کسی نے نشیمن جلا دیا

دیتے پھرو ثبوتِ وفا اب جہاں تہاں
الزام بے وفائی کا اس نے لگا دیا

ہتھیار پہلے عقل نے ڈھالے نئے نئے
دنیا کو پھر جنوں کا نشانہ بنا دیا

چنگاریوں کو اب کوئی پاگل ہوا نہ دے
شعلہ تو جیسے ہو سکا ہم نے بجھا دیا

معیارِ زندگی کو اُٹھانے کے شوق نے
کردار پستیوں سے بھی نیچے گرا دیا

یہ بھی تو سوچیے کبھی تنہائی میں ذرا
دنیا سے ہم نے کیا لیا؟ دنیا کو کیا دیا؟

بربادیوں سے لینا ہے کچھ کام اے حفیظؔ
یوں مرثیے کو ہم نے ترانہ بنا دیا

چھیڑ دو دل کی داستاں لوگو
آپ بندھ جائے گا سماں لوگو

میں نے اقبالِ جرم کر تو لیا
دیر اب کیا ہے حکمراں لوگو

ظلم تھک کر سوال کرتا ہے
کیوں نہیں مرتے سخت جاں لوگو

تب جمیں گے قدم جزیرے میں
جب جلا دو گے کشتیاں لوگو

دیکھ پاؤ گے کیا گھروں کے زخم
راستے کے رواں دواں لوگو

ہم اگر ترکِ گفتگو نہ کریں
اور بڑھ جائیں تلخیاں لوگو

جن کو اہلِ خرد کا ہاتھ لگا
اور اُلجھیں وہ گتھیاں لوگو

بات جب ہے کہ فاصلہ نہ رہے
فکر اور فن کے درمیاں لوگو

کھوئے کھوئے حفیظ پائے گئے
امتحاں پھر ہے امتحاں لوگو

ٹھٹک گئی ہے ہَوس مصلحت کے پاس آکر
وفا گزر بھی گئی تخت و تاج ٹھکرا کر

انھیں یہ طنز کے تیروں کی طرح لگتا ہے
ستم زدوں سے نہ ہنس کر مزاج پوچھا کر

نہ جانے چشمِ عنایت میں کیا نظر آیا
غریب رو دیا دامن کو اپنے پھیلا کر

مجھے یہ مشورہ خوشحال لوگ دیتے ہیں
ضمیر بیچ دے اپنا، خودی کا سودا کر

فضا پہ چھائی ہے مایوسیوں کی تاریکی
مرے یقین! مری راہ میں اُجالا کر

یہ لغزشیں ہی سنبھلنا تجھے سکھا دیں گی
قدم قدم پہ سہاروں کا منہ نہ دیکھا کر

حیات جس کی امانت تھی اس کو لوٹا دی
میں آج چین سے سوتا ہوں پاؤں پھیلا کر

حفیظؔ کو بھی ہے تائیدِ ظلم کی تاکید
یہ لوگ شمع سے کہتے ہیں تو اندھیرا کر

جانتے ہیں وہ حقیقت کو چھپا کر رکھنا
قتل کرنا جسے الزام اُسی پر رکھنا

حاکمِ وقت پہ جس وقت میں تنقید کروں
ہاتھ اُس وقت نہ یارو مرے مُنہ پر رکھنا

اس سے خونریزی کی لت بھی نہیں چھوڑی جاتی
تمغۂ امن بھی چاہے وہ ستمگر رکھنا

زر پرستوں کا تو اک کھیل ہے کردار کُشی
واسطہ اِن سے ذرا سوچ سمجھ کر رکھنا

جانے کب مُنھ سے نکل جائے کوئی کام کی بات
ربط ہم خانہ خرابوں سے برابر رکھنا

آج تصویر تو اک قِصّۂ پارینہ ہے
پاس اپنے مری آواز کے پیکر رکھنا

اِس سے ذہنوں کی بلندی کا پتہ چلتا ہے
نام ذرّوں کے تم اپنے مہ و اختر رکھنا

خونِ تقویٰ کی کوئی رند نہ بو پا جائے
ساقیا اچّھی طرح جام کو دھو کر رکھنا

آسماں اِس سے بہت دور ہے عظمت کا حفیظؔ
آشیاں فن کا نہ شہرت کے شجر پر رکھنا

بے ضمیروں کو بتانے جائیں کیا
وہ نہ سمجھیں گے انھیں سمجھائیں کیا

آگئے وہ آگئے اہلِ ہَوَس
اب تری محفل سے ہم اُٹھ جائیں کیا

باخبر تھے عشق کے انجام سے
عشق کے انجام پر پچھتائیں کیا

التجائیں تو کوئی سُنتا نہیں
اب ذرا کچھ بے ادب ہو جائیں کیا

آپ کے وعدے بہت بدنام ہیں
آپ کے وعدوں سے دل بہلائیں کیا

بے عصا اپنی کلیمی ہے تو ہو
وقت کے فرعون سے ڈر جائیں کیا

خیر سے مقتل میں نقّارے بھی ہیں
دور تک چیخیں ہماری جائیں کیا

شیخ قاتل کو مسیحا کہہ گئے
محترم کی بات کو جھٹلائیں کیا

چھوڑ کر دامانِ خودداری حفیظؔ
اپنی نظروں سے بھی ہم گر جائیں کیا

آج کچھ ایسا طے پایا ہے حق کے اجارہ داروں میں
ہم پر جو ایمان نہ لائیں چُنوا دو دیواروں میں

کون سی ہے تصویر ہماری کاش بتادے کوئی ہمیں
چہروں پر چھائی ہے اُداسی، رونق ہے بازاروں میں

سورج کو دو دیس نکالا، دن کا قصّہ پاک کرو
بنتے ہیں ایسے منصوبے رات کے رشتے داروں میں

غم بھی اک احسان ہے اس کا، شکر کرلے دل شکوہ کیا
غم تو ہماری روحِ رواں ہے، ہم نہیں غم کے ماروں میں

رازق پر کرتے ہیں بھروسہ اور نہ اپنی کوشش پر
خوشحالی کو ڈھونڈ رہے ہیں جو خالی گہواروں میں

اس کی ہاں میں ہاں نہ ملائی بس یہ جرم ہمارا ہے
واعظ نے شامل کر ڈالا ہم کو بھی میخواروں میں

اک جابر کا مجبوروں نے ایسے استقبال کیا
آنکلا ہو کوئی مسیحا جیسے درد کے ماروں میں

ہر ظالم سے ٹکّر لی ہے سچّے فن کاروں نے حفیظؔ
ہم وہ نہیں جو ڈر کر کہدیں "ہم ہیں تابعداروں میں"

مظلوموں کی آہ و فغاں پر، برہم کیوں ہو جاتے ہو
شوق نہیں رونے کا ہم کو، تم ہی تو رُلواتے ہو

ہم بھی تو انسان ہیں آخر، ہم سے یہ نفرت کیسی؟
سب سے لپٹ کر ملنے والو، ہم سے کیوں کتراتے ہو

ہمسایوں سے، ہم وطنوں سے لاشیں پوچھا کرتی ہیں
پیار کی باتیں کرنے والو، قاتل کیوں بن جاتے ہو

پیتے تھے جب تک پیتے تھے، چھوڑی تو بس چھوڑ ہی دی
تم بھی بہکنا چھوڑو یارو، ہم کو کیوں بہکاتے ہو

۱۷

ہم تو چلو جذباتی ٹھہرے اپنی کہو دانش مندو!
ٹھیس انا کو جب لگتی ہے، تم پاگل ہو جاتے ہو

ہم نے تمھارے ہاتھوں سے بھی سر پہ کفن بندھوایا تھا
تم بھی سُرخ سویرے والو درباری ہو جاتے ہو

دیکھو یہ پندارِ تقویٰ ٹھیک نہیں ہے مولانا!
شعر و ادب کا ذکر چھڑے تو چیں بجبیں ہو جاتے ہو

کومل کومل غزلوں میں طوفانوں کے پیغام حفیظ
میٹھی میٹھی باتوں سے بھی تم تو آگ لگاتے ہو

جانے کتنے ہنگاموں کی اس میں سمائی ہوتی ہے
سنّاٹے کی گہرائی بھی کیا گہرائی ہوتی ہے

ہم نے دل کے داغ چھپائے مُسکانوں کے پھولوں سے
سُن رکھا تھا چہرے سے بھی غم پیمائی ہوتی ہے

اپنے آپ سے کیا مل پاتے ایسے بِھیڑ بھڑکّے میں
عمر اسی اُمّید میں گزری اب تنہائی ہوتی ہے

ایسے موقع پر مت چھونا بھول کے اپنے دامن کو
اس سے رونے والے کی ہمّت افزائی ہوتی ہے

اُن کے تغافل کی میں جب بھی اُن سے شکایت کرتا ہوں
کہتے ہیں "اپنوں کے لیے ہی بے پروائی ہوتی ہے"

واعظ بھی آرام طلب ہیں، قائد بھی آرام طلب
راہبری تو مشکل ہے ہاں راہنمائی ہوتی ہے

درباری ماحول میں جینا مشکل ہے ہم لوگوں کا
یا تو دم گھٹ جاتا ہے یا تلخ نوائی ہوتی ہے

جو محسوس کیا کہہ بیٹھے سیدھے سادے لفظوں میں
ہم دیوانے کیا جانیں کیا شے دانائی ہوتی ہے

دل کا خون قلم سے ٹپکے تب تو ہے کچھ بات حفیظؔ
یوں ہونے کو کتنی ہی خامہ فرسائی ہوتی ہے

آباد رہیں گے ویرانے، شاداب رہیں گی زنجیریں
جب تک دیوانے زندہ ہیں پھولیں گی پھلیں گی زنجیریں

آزادی کا دروازہ بھی خود ہی کھولیں گی زنجیریں
ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گی جب حد سے بڑھیں گی زنجیریں

جب سب کے لب سل جائیں گے ہاتھوں سے قلم چھن جائیں گے
باطل سے لوہا لینے کا اعلان کریں گی زنجیریں

اندھوں بہروں کی نگری میں یوں کون توجّہ کرتا ہے
ماحول سُنے گا، دیکھے گا جس وقت بجیں گی زنجیریں

جو زنجیروں سے باہر ہیں، آزاد انھیں بھی مت سمجھو
جب ہاتھ کٹیں گے ظالم کے اس وقت کٹیں گی زنجیریں

یہ طور بھی ہیں صیّادی کے، یہ ڈھنگ بھی ہیں جلّادی کے
سمٹیں، سکڑیں گی زنجیریں، پھیلیں گی، بڑھیں گی زنجیریں

مجبوروں کو ترسائیں گی، یوں اور ہمیں تڑپائیں گی
زلفوں کی یاد دلائیں گی جب لہرائیں گی زنجیریں

زنجیریں تو ہٹ جائیں گی، ہاں ان کے نشاں رہ جائیں گے
میرا کیا ہے ظالم تجھ کو بدنام کریں گی زنجیریں

لے دے کے حفیظؔ ان سے ہی تھی اُمّیدِ وفا دیوانوں کو
کیا ہوگا جب دیوانوں سے ناتہ توڑیں گی زنجیریں

اِس دیوانے دل کو دیکھو کیا شیوہ اپنائے ہے
اُس پر ہی وِشواس کرے ہے جس سے دھوکہ کھائے ہے

سارا کلیجہ کٹ کٹ کر جب اشکوں میں بہہ جائے ہے
تب کوئی فرہاد بنے ہے، تب مجنوں کہلائے ہے

میں جو تڑپ کے روؤں ہوں تو ظالم یوں فرمائے ہے
اتنا گہرا گھاؤ کہاں ہے، ناحق شور مچائے ہے

اس کو ہی زنجیر کہے ہیں شاید یہ دیوانے لوگ
زنداں کے دروازے پر یہ زُلف سی جو لہرائے ہے

تم نے مجھ کو رنج دیا تو اِس میں تمہارا دوش نہیں
پُھول بھی کانٹا بن جائے ہے وقت بُرا جب آئے ہے

ایسے نرالے فریادی کی کیسے ہوگی داد رَسی؟
پہلے تو فریاد کرے ہے، پھر آنسو پی جائے ہے

میں بھی پھروں ہوں مارا مارا چھوڑ کے تیرے دامن کو
پیڑ سے جو پتّا ٹوٹے ہے، آوارہ ہو جائے ہے

پُوچھے ہے یاں کون میاں اربابِ علم و دانش کو
جو چِلّا کر بولے ہے وہ محفل پر چھا جائے ہے

صرف زباں کی نقّالی سے بات نہ بن پائے گی حفیظ
دل پر کاری چوٹ لگے تو میر کا لہجہ آئے ہے

رونا ہے کہاں، ہنسنا ہے کہاں، یہ بات مرا دل جانے ہے
تنہائی کا مطلب سمجھے ہے مفہومِ محفل جانے ہے

گر اپنے گھاؤ دکھاؤ گے، سولی پہ چڑھائے جاؤ گے
اس شہر کا منصف ایسا ہے، بسمل کو جو قاتل جانے ہے

ان اہلِ علم و دانش کے، ناقص ہیں سارے منصوبے
انساں کو بنانے والا ہی، انساں کے مسائل جانے ہے

ہم جینے سے تو اُوب گئے، مرنے سے مگر یوں ڈرتے ہیں
جو بویا ہے وہ کاٹیں گے، کیا بویا ہے، دل جانے ہے

اے ایسے ویسے فنکارو! مانو کہ بڑا فن کار ہے وہ
تشہیر کی کاوش کو بھی جو تخلیق میں شامل جانے ہے

اچھی طرح ذرا مجھے پہچان زندگی
انسان ہوں میں حضرتِ انسان زندگی

مجھ سے ترے حصار میں ٹھہرا نہ جائے گا
میدان - میرے واسطے میدان زندگی

ہم نے لکھا ہے اپنے شہیدوں کے خون سے
مقتل کی داستان کا عنوان زندگی

پہنے ہوئے ہے ریشم و کمخواب کا کفن
یارانِ بے ضمیر کی بے جان زندگی

من مانیوں کا راج ہے سارے سماج میں
جیسے ہو کوئی عہد نہ پیمان زندگی

باطل کے اقتدار پہ چیں بر جبیں نہیں
حق کے سپاہیوں کی تن آسان زندگی

غیروں سے پوچھتی ہے طریقہ نجات کا
اپنوں کی سازشوں سے پریشان زندگی

وہ زخم ہوں کہ جس پہ بڑے اہتمام سے
خالی کرے ہے اپنے نمکدان زندگی

کم ظرف محسنوں کا ستایا ہُوا ہوں میں
مجھ پر نہ کیجیو کوئی احسان زندگی

میں نے بُرا کیا جو تجھے بے وفا کہا
اپنے حفیظؔ کا نہ بُرا مان زندگی

سمجھ رہا تھا کہ محفوظ اپنے گھر میں ہوں
مگر یہ گھر نے بتایا کہ میں بھنور میں ہوں

یہ اور بات مداوا مجھے نصیب نہ ہو
یہی بہت ہے کہ فہرستِ چارہ گر میں ہوں

تجھے قفس سے رہائی دلا نہیں سکتا
کہ خود اسیر میں زندانِ بال و پر میں ہوں

یہ دیکھنا ہے کہ میداں میں آئیں گے کتنے
ابھی پیام لیے گشتِ در بدر میں ہوں

گرا دیا مجھے کس نے ہَوس کے قدموں پر
یہ کیسے بھول گیا میں تری نظر میں ہوں

مرے شعور نے رکھّا مجھے غرور سے دور
میں آسماں پہ سہی پھر بھی رہگزر میں ہوں

جُھلستے ہاتھ سے پھر دوپہر اُٹھا لے گی
شگفتہ ہوں کہ ابھی دامنِ سحر میں ہوں

میں وقت ہوں مری تقدیر میں قیام نہیں
حفیظ قبلِ ازل ہی سے میں سفر میں ہوں

روودادِ غمِ پنہاں کیا لکھّی ہے چہرے پر
سب مجھ سے یہ کہتے ہیں راتوں کو نہ جاگا کر

گر تجھ سے میں ٹکراؤں، پل بھر میں بِکھر جاؤں
میں اپنی جگہ شیشہ، تو اپنی جگہ پتھّر

"تکرار سے کیا حاصل، مِل جُل کے گزر کر لیں"
کل رات یہ کہتا تھا رہزن سے مرا رہبر

عیّاری نہیں ہے یہ، فنکاری ہے فنکاری
اشعار سُنا تھوڑے، تقریر زیادہ کر

تنقید سے شاعر کی تقدیر سنورتی ہے
تعریف کے متوالے! تنقید گوارا کر

شہرت کی مشینوں نے نام اس کا اُچھالا ہے
مشہور ہے جتنا وہ اتنا نہیں قد آور

گاہک کی ضرورت کو یہ خوب سمجھتے ہیں
اب چہرے بھی رکھتے ہیں آئینوں کے سوداگر

خود اہلِ نظر ہیں یہ تو شعر سُناتا جا
سمجھا نہ حفیظؔ اِن کو اشعار کے پس منظر

زندگی کی بے پناہی کا مداوا کیا کرے
چلچلاتی دھوپ میں زلفوں کا سایا کیا کرے

کہہ دیا دنیا سے ہم نے "ہم تو حق کے ساتھ ہیں"
دیکھنا ہے اب ہمارے ساتھ دُنیا کیا کرے

ہر سہارا بے عمل کے واسطے بیکار ہے
آنکھ ہی کھولے نہ جب کوئی اُجالا کیا کرے

اِس سے پہلے آدمی کی اتنی بے قدری نہ تھی
سوچتی ہے آج دنیا آدمی کا کیا کرے

تھم گئے آنسو جب اس نے رکھ دیئے آنکھوں پہ ہاتھ
راستے ہی بند ہو جائیں تو دریا کیا کرے

حسن کے نزدیک، ہم ہوتے گئے ہوتے گئے
کوئی دامن زد میں آجائے تو شعلہ کیا کرے

کچھ تو ہوگی رکھ رکھاؤ کی بھی آخر انتہا!
غم اگر حد سے زیادہ ہو تو چہرہ کیا کرے

رنجِ فرقت ہے محبت کا مقدر اے حفیظؔ
اس میں رادھا کیا کرے اس میں کنھیّا کیا کرے
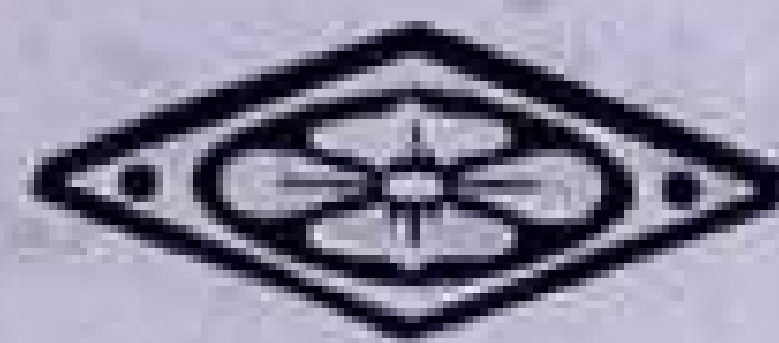
اِس لیے ارمان قاتل کے ابھی نکلے نہیں
مرنے والے مر گئے چُپ چاپ کچھ تڑپے نہیں

جس نے جو چاہا اسے اپنا بنا کر لے لیا
جانتے تھے سب، کسی سے ہم کبھی لڑتے نہیں

خُون تھکوا دیں اگر مرنے کی جی میں ٹھان لیں
جتنا تم سمجھے ہوئے ہو اتنے ہم بودے نہیں

جبر تھا تاریخ کا یا اور کوئی بات تھی
مسئلے اُلجھے کچھ ایسے آج تک سُلجھے نہیں

جانے کیا کیا لے گئے اور دے گئے ہیں بس فریب
اجنبی مہمان میرے صبح تک ٹھہرے نہیں

اُس کے بیٹے کی بھی کیوں تعریف اس سے کیجیے
جانے اب ان کے مراسم کیسے ہیں کیسے نہیں

تبصرہ ہم بھی کریں گے تیرنے والوں پہ آج
گرچہ پانی میں کبھی ہم آج تک اُترے نہیں

فن سے جو فنکار خالی تھے وہ کیا پاتے مقام
یار لوگوں نے اُبھارا تو مگر اُبھرے نہیں

اس عیادت سے تسلّی بھی ہوئی، تکلیف بھی
کچھ ترس کھا کر مجھے دیکھا مگر بولے نہیں

آہ یہ بے فیض اہلِ شان و شوکت اے حفیظؔ
ایسے محلوں کی طرح ہیں جن میں دروازے نہیں

ظلم کے بیکار سب ہتھیار ہو جائیں گے آپ
جس گھڑی فریاد سے للکار ہو جائیں گے آپ

ہر ادا کے اَن گنت مفہوم گنواتے ہیں لوگ
کیا خبر تھی اس قدر تہ دار ہو جائیں گے آپ

روز ترکِ جَور کا احساں جتایا جائے گا
اس طرح بھی درپئے آزار ہو جائیں گے آپ

کہنے سُننے سے زیادہ بات بڑھ جائے گی اور
مختصر یہ ہے کہ وہ ہموار ہو جائیں گے آپ

اپنی عظمت کے قصیدے خود سُنائیں گے اگر
حلقۂ اہلِ نظر میں خوار ہو جائیں گے آپ

ایک سونا پن رہے گا آرزوؤں کے بغیر
حضرتِ دل! شہرِ بے بازار ہو جائیں گے آپ

باری باری جاگنا ہے خوف سے شبخون کے
ہم تبھی سوئیں گے جب بیدار ہو جائیں گے آپ

ناز برداری نہ کیجے اہلِ دولت کی حفیظ
رفتہ رفتہ حاشیہ بردار ہو جائیں گے آپ

دل فروشوں کے لیے کوچہ و بازار بنے
اور جانبازوں کی خاطر رسن و دار بنے

بس یہی دَوڑ ہے اِس دَور کے انسانوں کی
تیری دیوار سے اونچی مری دیوار بنے

چھین کر غیر سے اپنوں نے مجھے قتل کیا
آپ ہی ڈھال بنے، آپ ہی تلوار بنے

ہو گئے لوگ اپاہج یہی کہتے کہتے
ابھی چلتے ہیں ذرا راہ تو ہموار بنے

مجھ کو ممنونِ کرم کر کے وہ فرماتے ہیں
آدمی سوچ سمجھ کر ذرا خوددار بنے

خودشناسی کے نہ ہونے سے یہی ہوتا ہے
جن کو فن کار نہ بننا تھا وہ فن کار بنے

تجھ سے کتنا ہے ہمیں پیار یہ کچھ اندازہ کر
ہم ترے چاہنے والوں کے روادار بنے

شان و شوکت کے لیے تو ہے پریشان حفیظؔ
اور میری یہ تمنّا ترا کردار بنے

گدازِ دل سے ملا، سوزشِ جگر سے ملا
جو قہقہوں میں گنوایا تھا چشمِ تر سے ملا

تعلّقات کے اے دل ہزار پہلو ہیں
نہ جانے مجھ سے وہ کِس نقطۂ نظر سے ملا

کبھی تھکن کا کبھی فاصلوں کا رونا ہے
سفر کا حوصلہ مجھ کو نہ ہم سفر سے ملا

میں دوسروں کے لیے بے قرار پھرتا ہوں
عجیب درد مجھے میرے چارہ گر سے ملا

ہر انقلاب کی تاریخ یہ بتاتی ہے
وہ منزلوں پہ نہ پایا جو رہگزر سے ملا

نہ میں نے سوز ہی پایا نہ استقامت ہی
حجر حجر کو ٹٹولا، شجر شجر سے ملا

جُدا ہے سارے زمانے سے اپنے فن کا مزاج
نہ کوہکن سے ملا اور نہ شیشہ گر سے ملا

حفیظ ہو گیا آخر اجل سے ہم آغوش
تمام شب کا ستایا ہوا سحر سے ملا

(اِهلیہ کے سانحۂ قتل پر)

اے دل خوشی کا ذکر بھی کرنے نہ دے مجھے
غم کی بلندیوں سے اُترنے نہ دے مجھے

گھر ہی اُجڑ گیا ہو تو لطفِ قیام کیا
اے گردشِ مدام ٹھہرنے نہ دے مجھے

مقصد یہ ہے سکوں کسی صورت نہ ہو نصیب
اے چارہ ساز بات بھی کرنے نہ دے مجھے

چہرے پہ کھال تک بھی نہ چھوڑیں گے بدنگاہ
اے میرے خیر خواہ سنورنے نہ دے مجھے

ہے دیکھنے کی چیز جو بسمل کا رقص بھی
دنیا یہ چاہتی ہے کہ مرنے نہ دے مجھے

یہ دور سنگدل ہی نہیں تنگدل بھی ہے
گر بس چلے تو آہ بھی کرنے نہ دے مجھے

اب بھی یہ حوصلہ ہے کہ کچھ کام آسکوں
میں ٹوٹ تو گیا ہوں بکھرنے نہ دے مجھے

عطرِ مجموعہ

مندرجہ بالا عنوان کے تحت اگلے صفحات پر اس کتاب کے منتخب اشعار درج کیے جا رہے ہیں۔ اشعار کے انتخاب میں زیادہ تر اُن کی یہ خصوصیت پیشِ نظر رکھی گئی ہے کہ وہ QUOTABLE ہوں یعنی تحریر و تقریر اور گفتگو میں موقع و محل کے لحاظ سے استعمال کیے جا سکیں

اس انتخاب کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ جو حضرات وقت کی کمی کے باعث پوری کتاب کا مطالعہ کرنے سے قاصر ہوں وہ 'عطرِ مجموعہ' سے ہی صاحبِ مجموعہ کے فکر و فن کا اندازہ خاصی حد تک کر سکتے ہیں۔

مُرتّب

ابھی سے ہوش اُڑے مصلحت پرستوں کے
ابھی میں بزم میں آیا ابھی کہاں بولا
حصارِ جبر میں زندہ بدن جلائے گئے
کسی نے دم نہیں مارا مگر دھواں بولا
اثر ہوا تو یہ تقریر کا کمال نہیں
مرا خلوص مخاطب تھا میں کہاں بولا

پاسباں آنکھیں ملے، انگڑائی لے، آواز دے
اتنے عرصے میں تو اپنا کام کر جاتی ہے آگ
حل ہوئے ہیں مسئلے شبنم مزاجی سے مگر
گتھیاں ایسی بھی ہیں کچھ جن کو سلجھاتی ہے آگ

وہ وقت کا جہاز تھا کرتا لحاظ کیا
میں دوستوں سے ہاتھ ملانے میں رہ گیا
میدانِ کارزار میں آئے وہ قوم کیا
جس کا جوان آئنہ خانے میں رہ گیا

سمجھ کے سوچ کے ہم کو خوش آمدید کہو
ہمارے ساتھ مسائل کا قافلہ بھی ہے

ابھی کیا ہے کل اک اک بوند کو ترسے گا میخانہ
جو اہلِ ظرف کے ہاتھوں میں پیمانے نہیں آئے
اسی میں کچھ فراقِ یار کی گھڑیاں گزر جاتیں
کہاں ہیں آج ناصح بھی تو سمجھانے نہیں آئے

میں کیوں اہلِ جہاں کی تُرش روئی کا بُرا مانوں
گراں خوابی میں جھنجلایا ہی کرتے ہیں جگانے پر
کہاں کے ناخُدا، کس کے سفینے، دست و بازو کیا
خدا ہی یاد آتا ہے سہارے ٹوٹ جانے پر

تعلّقات کے اے دل ہزار پہلو ہیں
نہ جانے مجھ سے وہ کس نقطۂ نظر سے ملا
ہر انقلاب کی تاریخ یہ بتاتی ہے
وہ منزلوں پہ نہ پایا جو رہگزر سے ملا

ہمسایوں سے ہموطنوں سے لاشیں پوچھا کرتی ہیں
پیار کی باتیں کرنے والو قاتل کیوں بن جاتے ہو

ایسے موقع پر مت چھونا بھول کے اپنے دامن کو
اس سے رونے والے کی ہمّت افزائی ہوتی ہے

بس یہی دَوڑ ہے اِس دَور کے انسانوں کی
تیری دیوار سے اونچی مری دیوار بنے
خود شناسی کے نہ ہونے سے یہی ہوتا ہے
جن کو فنکار نہ بننا تھا وہ فنکار بنے

تھم گئے آنسو جب اُس نے رکھ دئیے آنکھوں پہ ہاتھ
راستے ہی بند ہو جائیں تو دریا کیا کرے
کچھ تو ہوگی رکھ رکھاؤ کی بھی آخر انتہا
غم اگر حد سے زیادہ ہو تو چہرہ کیا کرے
ہر سہارا بے عمل کے واسطے بیکار ہے
آنکھ ہی کھولے نہ جب کوئی، اُجالا کیا کرے

یہ اور بات مداوا مجھے نصیب نہ ہو
یہی بہت ہے کہ فہرستِ چارہ گر میں ہوں
پھسلتے ہاتھ سے پھر دوپہر اُٹھا لے گی
شگفتہ ہوں کہ ابھی دامنِ سحر میں ہوں

جب سب کے لب سِل جائیں گے، ہاتھوں سے قلم چھن جائیں گے
باطل سے لوہا لینے کا اعلان کریں گی زنجیریں

خُدا کا شکر کہ محفل میں ذکرِ دار چھڑا
ہمیں تو آنے لگی تھیں جماہیاں لوگو

اپنی ہستی پہ نہ اِترائے کوئی کوہِ غرور
وقت نے پھینک دیئے ایسے اُٹھا کر کتنے

آنکھوں کی قسم ہم سے تو دیکھے نہیں جاتے
نادار کے آنسو ہوں کہ زردار کے آنسو
ہنس کر وہ مرے گریۂ پیہم پہ یہ بولے
"کیا دیکھئے دیکھے ہوئے سو بار کے آنسو"

غمگسار آئیں نہ آئیں بزم برپا ہو نہ ہو
دل جلوں سے دل جلے کہہ سُن کے افسانے اُٹھے

اُس کے بینے کی بھی کیوں تعریف اس سے کیجیے
جانے اب ان کے مراسم کیسے ہیں کیسے نہیں
تبصرہ ہم بھی کریں گے تیرنے والوں پہ آج
گرچہ پانی میں کبھی ہم آج تک اُترے نہیں
اس عیادت سے تسلّی بھی ہوئی، تکلیف بھی
کچھ ترس کھا کر مجھے دیکھا مگر بولے نہیں

بادِ صبا یہ ظلم خدارا نہ کیجیو
اُس بے وفا سے ذکر ہمارا نہ کیجیو
غم کی کمی نہیں ہے جہانِ خراب میں
اے دل ترس ترس کے گزارا نہ کیجیو
ایسا نہ ہو کہ لوگ ہمیں پوجنے لگیں
اتنا بھی احترام ہمارا نہ کیجیو

رنگ آنکھوں کے لیے ۔ بو ہے دماغوں کے لیے
پھول کو ہاتھ لگانے کی ضرورت کیا ہے

ایک ٹھوکر کی حقیقت کچھ نہیں ۔ یوں تو مگر
کھول دے آنکھیں تو ساری عمر کا حاصل کہیں
ظلم ہے یہ بھی سراسر یہ بھی اک توہین ہے
جانِ محفل کو اگر ہم رونقِ محفل کہیں
ایک تو کشتی ڈبو دی ناخدا نے اور پھر
اس پہ اُترا ہے کہ ہم گرداب کو ساحل کہیں

ذات کو رات کہہ دیا میں نے
سُنتے ہی ۔ بوکھلا گئی دنیا

ہنسی ہنسی میں تمہارے جو وار ہوتے ہیں
ستم گری کے وہی شاہکار ہوتے ہیں

ہم ایسے لوگوں سے کیوں دور دور رہتے ہو
ہم ایسے لوگ تو یاروں کے یار ہوتے ہیں

ذلیل کرتے ہیں خود تبصرہ نگاروں کو
وہ تبصرے جو فقط اشتہار ہوتے ہیں

کہاں یہ سطح پسندی ادب کو لے آئی
جہاں نظر کی بلندی نہ دل کی گہرائی

ہزار حیف کہ ہم تیرے بے وفا ٹھہرے
ہزار شکر کہ ہم کو ہَوس نہ راس آئی

حیات پوچھ رہی تھی سکون کا مفہوم
تڑپ کے دل نے ترے درد کی قسم کھائی

اے دل ہجومِ غم میں غنیمت ہے بے کسی
چیخیں نکل پڑیں جو کوئی مہرباں ملے

آتی تھی قہقہوں کی صدا دور سے حفیظؔ
دیکھا قریب جاکے تو آنسو رواں ملے

شیشہ ٹوٹے غُل مچ جائے
دل ٹوٹے آواز نہ آئے
ہائے وہ نغمہ جس کا مُغنّی
گاتا جائے، روتا جائے

اُن کے جانے کا منظر تماشہ نہیں
دور تک دیکھیے، دیر تک سوچیے
درد پر تبصرہ تو بہت ہوچکا
درد کو آپ محسوس بھی کیجیے

ہم اگر ترکِ گفتگو نہ کریں
اور بڑھ جائیں تلخیاں لوگو
دیکھ پاؤ گے کیا گھروں کے زخم
راستے کے رواں دواں لوگو
تب جمیں گے قدم جزیرے میں
جب جلا دو گے کشتیاں لوگو

اس دَورِ بے ضمیر میں جینا سکھا دیا
حالات نے ہمیں بھی منافق بنا دیا

سرور ایک جھلک کا تمام عمر رہا
ہَوس پرست تھے جو بار بار دیکھتے تھے
نہ دیجیے انھیں الزام قتل کا وہ تو
بس اک ذرا نئے خنجر کی دھار دیکھتے تھے

حیات و موت کرشمے ہیں ان کی شوخی کے
کبھی یہاں سے پُکارا کبھی وہاں سے مجھے

ملتے ہی کچھ اس طرح اُمڈ آئے ہیں آنسو
جیسے کہ یہ رخصت ہے ملاقات نہیں ہے
اب کُھل کے کہو بات تو کچھ بات بنے گی
یہ دَورِ اشارات و کنایات نہیں ہے

جب کسی گُلفام کا دامن اُلجھ کر رہ گیا
خار کو محسوس اپنی برتری ہونے لگی
رفتہ رفتہ اور بھی پابندیاں ہٹ جائیں گی
مُحتسب کے شہر میں شیشہ گری ہونے لگی

کیسے اللہ والے ہیں یہ اے خُدا
گفتگو، مشورے، سازشوں کی طرح

خون اِس دَورِ گرانی میں بہت سستا ہے
رات پھر گاؤں میں اک قتل ہوا پانی پر

مردانِ حق پرست کو ہر کربلا قبول
پیچیدہ مسئلہ ہو تو کچھ غور بھی کریں

ملے تھے ملنے کو لیکن جُدا جُدا ہی رہے
سبب یہ ہے کہ سب اپنا وقار دیکھتے تھے

بڑے لوگوں کو جانے کیوں بُرا محسوس ہوتا ہے
نظر آتے ہیں جب آثار چھوٹوں میں بڑائی کے

خبر نہیں کہ گرے ہیں کہاں کہاں آنسو
کدھر کدھر سے اُٹھے گا دھواں نہیں معلوم

دریدہ پیرہنی پر بھی فقر جامہ زیب
ہَوس ہزار طرح کے لباس میں عُریاں

پہنے ہوئے ہے ریشم و کمخواب کا کفن
یارانِ بے ضمیر کی بے جان زندگی

سفر کے نام سے چیں بر جبیں رہے جو لوگ
وہ منزلوں پہ ملے میرِ کارواں کی طرح

کہنے سُننے سے زیادہ بات بڑھ جائے گی اور
مختصر یہ ہے کہ وہ ہموار ہو جائیں گے آپ
ایک سوناپن رہے گا آرزوؤں کے بغیر
حضرتِ دل شہرِ بے بازار ہو جائیں گے آپ
باری باری جاگنا ہے خوف سے شبخون کے
ہم تبھی سوئیں گے جب بیدار ہو جائیں گے آپ

ہمیں تو بادِ صبا کا بھی اعتبار نہیں
خزاں سے ہاتھ ملا کر چمن میں آئی ہے

دولت نے ہم سے ہاتھ ملایا تو ہے مگر
اس دشمنِ قرار سے کیا دوستی کریں

الٰہی کون سی منزل ہے یہ دنیا پرستی کی؟
کسی نے نام پوچھا اور سجدہ کر لیا میں نے
نہ ہوں حیران میرے قہقہوں پر مہرباں میرے
فقط فریاد کا معیار اونچا کر لیا میں نے

میں جو تڑپ کے روؤں ہوں تو ظالم یوں فرمائے ہے
اتنا گھبراگھاؤ کہاں ہے ناحق شور مچائے ہے

اے پرستارانِ نغمہ چھوڑ کر تارِ رباب
آج کچھ دُکھتی رگوں پر انگلیاں رکھتا ہوں میں
آج تک گزری اجل کی آرزو میں زندگی
زندگی سے آج بھی دلچسپیاں رکھتا ہوں میں

میں یوں رہزن کے بدلے پاسباں پر وار کرتا ہوں
مرے گھر کی تباہی ہے نگہبانوں سے وابستہ
محبّت خامشی بھی، چیخ بھی، نغمہ بھی، نعرہ بھی
یہ اک مضمون ہے کتنے ہی عنوانوں سے وابستہ

گھروں سے تا درِ زنداں وہاں سے مقتل تک
ہر امتحاں سے ترے جاں نثار گزرے ہیں

اُف یہ جادہ کہ جسے دیکھ کے جی ڈرتا ہے
کیا مسافر تھے جو اس راہ گزر سے گزرے
راہ روکے ہوئے خود راہنما بیٹھے ہیں
اب کوئی قافلہ گزرے تو کدھر سے گزرے

کوئی فریب نہ کھائے سفید پوشی سے — نہ جانے کتنے ستارے نگل گئی ہے سحر

کیسی ہی مصیبت ہو بڑے شوق سے آئے
کم ظرف کے احسان سے اللہ بچائے
جس شاخ نے آغوش میں کلیوں کو کھلایا
اس شاخ نے پھولوں کے جنازے بھی اٹھائے

یہ بھی کیا اے غمگسارو. مجھ سے چھِن جانے کو ہے؟
زندگی پر آج اتنا پیار کیوں آیا مجھے؟

آگیا جب سامنے تقدیر کا لکھّا ہوا
سب جلا ڈالیں تری جتنی بھی تحریریں ملیں

ایک بھی لفظ ہٹانے کی نہیں گنجائش
میرے پیغامِ محبّت کا خلاصہ نہ کرو
یہ تعلّق کی خراشیں بھی مزا دیتی ہیں
روٹھ جائے کوئی تم سے تو منایا نہ کرو
آج بھی میں نہیں انسان سے مایوس کہ جب
لوگ کہتے ہیں خدا پر بھی بھروسہ نہ کرو

قیاس کیجیے کتنا بُرا زمانہ ہے حفیظ جی بھی بھلوں میں شمار ہوتے ہیں

فن سے جو فنکار خالی تھے وہ کیا پاتے مقام
یار لوگوں نے اُبھارا تو مگر اُبھرے نہیں

آٹھ دس غزلیں مسلسل آٹھ دس غزلیں حضور
سب عطا ہوں ورنہ پھر بیمار ہو جائیں گے آپ

عیّاری نہیں ہے یہ فن کاری ہے فن کاری
اشعار سُنا تھوڑے تقریر زیادہ کر

لیجیے مل گئی بیچارے غریبوں کو دوا
پڑھ کے اک شخص نے کچھ پھونک دیا پانی پر

میخانے کی سمت نہ دیکھو جانے کون نظر آجائے

اب خدا حافظ متاعِ دین و دانش کا حفیظ
واعظِ کج فہم بھی تقریر فرمانے اُٹھے

حفیظ اس میں کسی کا کیا اجارہ ہوا گر شیخ بیعت برہمن سے

ضروری ہے کفن بر دوش رہنا　　وطن ہے کوچۂ قاتل ہمارا

کتنے چہروں کی بشاشت کا ہے اس پر انحصار
میری مصنوعی خوشی کی قدر کیا جانے کوئی
یونہی مت کر لیجیے احسان کے تحفے قبول
جانے کس احسان کے بدلے میں کیا مانگے کوئی

یہ بات نرالی دلِ خوددار کرے ہے　　تڑپے ہے مگر درد سے انکار کرے ہے
تقریر سے ممکن ہے نہ تحریر سے ممکن　　وہ کام جو انسان کا کردار کرے ہے

التجائیں تو کوئی سُنتا نہیں　　اب ذرا کچھ بے ادب ہو جائیں کیا
بے عصا اپنی کلیمی ہے تو ہو　　وقت کے فرعون سے ڈر جائیں کیا
شیخ قاتل کو مسیحا کہہ گئے　　محترم کی بات کو جھٹلائیں کیا
خیر سے مقتل میں نقّارے بھی ہیں　　دور تک چیخیں ہماری جائیں کیا

بے سہاروں کا انتظام کرو　　یعنی اک اور قتلِ عام کرو
یہ ہُنر بھی بڑا ضروری ہے　　کتنا جُھک کر کسے سلام کرو
بد دعا دے کے چل دیا وہ فقیر　　کہہ دیا تھا کہ کوئی کام کرو

حیات جس کی امانت تھی اس کو لوٹا دی
میں آج چین سے سوتا ہوں پاؤں پھیلا کر
حفیظ کو بھی ہے تائیدِ ظلم کی تاکید
یہ لوگ شمع سے کہتے ہیں تو اندھیرا کر

جانے کب مُنہ سے نکل جائے کوئی کام کی بات
ربط ہم خانہ خرابوں سے برابر رکھنا
خونِ تقویٰ کی کوئی رند نہ بو پا جائے
ساقیا! اچھی طرح جام کو دھو کر رکھنا
اس سے ذہنوں کی بلندی کا پتہ چلتا ہے
نام ذرّوں کے تم اپنے مہ و اختر رکھنا

کچھ اوک سے پیتے ہیں تو کچھ جام بکف ہیں
ساقی تری محفل میں مساوات نہیں ہے

ہم جینے سے تو اُوب گئے، مرنے سے مگر یوں ڈرتے ہیں
جو بویا ہے وہ کاٹیں گے، کیا بویا ہے دل جانے ہے

دیکھنے اور جاننے کی چیز یہ ہے کہ شاعر نے فکر کی کس سطح پر شاعری کی ہے؟ اُس کے افکار کا طول و عرض اور وزن و عمق کیا ہے؟ اُس نے وقت کے تقاضوں کو کس حد تک اپنے کلام میں سمویا ہے؟ وہ اپنے عہد کی بصیرتوں کو کس حد تک ذاتی بصیرتوں میں تبدیل کر سکا ہے؟ اپنے دَور کی بنیادی قدروں پر اُس کی ذہنی گرفت کا کیا عالم ہے؟ فن کے تقاضوں کی پاسداری اس کے یہاں کتنی ہوئی ہے؟ فن اور مقصد کے امتزاج میں اُس کی کامیابی کا اوسط کیا ہے؟ غزل کی رمزیت اور ایمائیت کو اُس نے کس طور سے برتا ہے پھر یہ کہ غزل گو کی حیثیت سے غزلیہ اسلوب کی جانب اُس کا مجموعی رویّہ کس قسم کا ہے؟

ان سوالوں کے جواب اگر حفیظ صاحب کے کلام میں تلاش کیے جائیں تو میرے خیال میں یہ جستجو بے نتیجہ ثابت نہ ہوگی۔ غزل کی طرف حفیظ صاحب کا رویّہ ایک تخلیقی اور متحرک رویّہ ہے۔ اُن کے یہاں غزل کی روایت کی پاسداری بھی ہے اور غزل کے فنّی لوازم کا احترام بھی۔ غزل کے رموز و علائم کو انھوں نے سلیقے کے ساتھ برتا ہے اور تقریباً ہر جگہ تخیّل اور جذبے کی خلّاقانہ قوّت سے کام لینے کی کوشش کی ہے۔

حفیظ کے یہاں جگہ جگہ ایک والہانہ جوش اور سرمستانہ کیفیت ملتی ہے جو اُن کے غایتی میلان کے منافی بھی نہیں اور کلام کی فنّی سطح کو بھی اوپر اٹھاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دَور میں غزل کی صنف کو اپنانا اور معقولیت اور معنویت کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے غزل سرائی کا تہیّہ کرنا ہی کیسی کچھ جگرداری کا کام ہے پھر اس میں فکری و نظریاتی شعور کی ترجمانی کا اضافہ اس راستے کو جتنا دشوار گزار بنا دیتا ہے، اُس کا تصوّر بھی شاید ہر شخص کے لیے ممکن نہ ہوگا۔

اختر انصاری دہلوی
(مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ)

PUBLISHERS, DISTRIBUTORS
IMPORTERS & EXPORTERS
A 111 MAYUR KUSHAL S. ABIDS
HYDERABAD - 500 001 INDIA
TEL 237864